Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1969

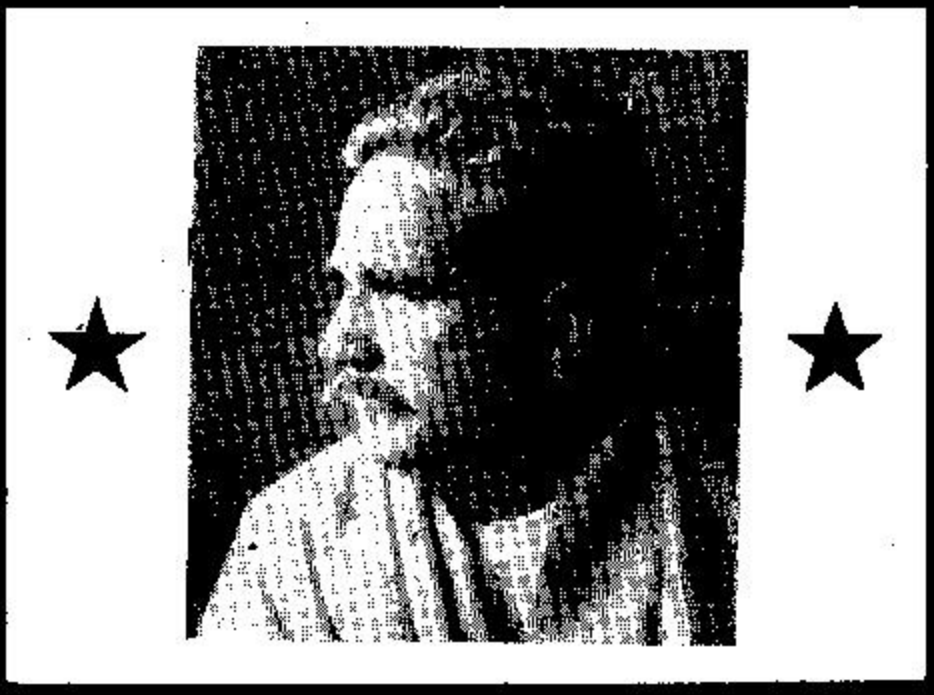

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے
سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے
سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ۸۰ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

جلد (۲۲) — اپریل ۱۹۶۹ء — نمبر (۴)

فہرست

۱۔ لمعات ـــ ۲
۲۔ اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۹
۳۔ سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ ـــ ۲۵
۴۔ مشرق و مغرب ـــ ۵۴
۵۔ معرکۂ دین و وطن ـــ (علامہ اقبالؒ) ـــ ۵۹
۶۔ قانونی مشورے ـــ (محترم ظفر حسن محمود صاحب) ـــ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۲۱ - اپریل کی یاد میں

۸ - اپریل ۱۹۳۸ء کو طلوع اسلام کے دورِ جدید کا پہلا شمارہ منظرِ اشاعت پر آیا۔ یہ پرچہ ابھی تقسیم نہ ہونے پایا تھا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے سانحۂ رحلت نے فلسفہ و حکمت کی بارگاہوں میں بالعموم اور عالمِ اسلام کے طول و عرض میں بالخصوص ماتم کی صفیں بچھا دیں۔ علامہ مرحوم سے طلوع اسلام کا قلب و نگاہ کا کس قدر گہرا رشتہ قائم تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ نام خود حضرت مرحوم و مغفور نے تجویز کیا۔ اور ادارہ کی طرف سے پہلے ہی شمارہ میں یہ الفاظ ذیل اس جریدہ کی پیشکش ان کے حضور میں کی گئی۔

> ہم کمالِ عقیدت و نیازمندی کے ساتھ رسالہ "طلوع اسلام" کو ترجمانِ حقیقت حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح نئی روشنی کی پیدا کردہ تاریکی میں ان کا جلوۂ فکر آفتابِ اسلام کے نئے طلوع کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح یہ رسالہ ان کے پرتوِ افکار سے حقیقی معنوں میں اسم با مسمّٰی ثابت ہو۔ "طلوع اسلام" نہایت ادب سے ان کے حضور میں متقاضی ہے کہ
>
> مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن
> ز خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

اسی شمارہ میں ادارہ طلوع اسلام کو حضرت علامہؒ کی یہ تازہ ترین غیر مطبوعہ رباعی شائع کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا کہ

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اس پرچہ کے افتتاحیہ میں ادارہ نے علامہ اقبالؒ کی گراں قدر شخصیت کو مبدا رفیض کی کرم گستری قرار دیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ

> اس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا۔ آج ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اس پیام کے اندر ہے کہ یہ پیام دراصل قرآن کریم کا پیام ہے۔ حضرت علامہ مدظلہٗ العالی کی باریک بین اور دور رس نگاہیں حقائق قرآن کو سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں ان سے کوئی دیدہ ور نا واقف نہیں۔ ملتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اس موہبتِ عظمےٰ پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔

یہ تھیں وہ امنگیں اور آرزوئیں جو طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت کے سلسلے میں حکیم الامت کی ذاتِ گرامی سے وابستہ کیں، لیکن آہ!

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ اس شدتِ آرزو کو لئے حضرت علامہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ یہ پہلا اور آخری شمارہ تھا جس کی نگارشات کو اس بارگاہ قلندری میں شرفِ قبول حاصل ہوا۔ اور پھر ۲۱- اپریل کو ہم ہمیشہ کے لئے اس دانائے راز کی طبیعی رفاقت اور سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ یہ حادثہ اس قدر دلدوز و جگر سوز تھا کہ طلوعِ اسلام نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے جو ضمیمہ شائع کیا، اس میں لکھا۔

> اس قیامت خیز حادثہ جانکاہ کی جگر گدازی اس بچے سے پوچھئے جو آنکھ کھولتے ہی یتیم ہو جائے۔ ہم کشمکشِ حیات کی اس بھیانک وادی میں اس بھروسہ پر گامزن ہوئے تھے کہ اگر ہمارے پاؤں میں ذرہ سی بھی لغزش آئی تو ایک انگلی پکڑ کر اٹھانے والا ساتھ موجود ہے۔ لیکن مشیت کے فیصلے نے پہلے ہی قدم پر یہ آسرا ہم سے چھین لیا گیا۔ اور ہمارے مسرت کے قہقہے خون کے آنسوؤں میں بدل گئے ......
>
> پیامِ اقبالؒ کی شمعِ نورانی "طلوعِ اسلام" کے لئے خضرِ راہ ہوگی اور اس کی تابندگی و درخشندگی سے باطل کی ہر تاریکی کو مٹانا اس کا مقصدِ حیات ہوگا۔ واللہ المستعان۔
>
> (دہلی ۲۱- اپریل ۱۹۳۸ء)

اقبالؒ کی طبیعی مفارقت کے سانحہ کو ۶۰ سال گزر گئے لیکن اس کی بصیرتِ قرآنی اس طویل اور کٹھن سفر

میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کے لئے نشانِ منزل کا کام دیتی رہی۔ اس مدت میں بڑے اہم انقلابات برپا ہوئے۔ یہ انقلابات رفتہ رفتہ اس عظیم تحریک کے نشانِ راہ بنتے گئے جو بالآخر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی تشکیل پر منتج ہوتی۔ اور کون نہیں جانتا کہ ہماری آزادی و استقلال کی یہ منزل بھی اسی مردِ قلندر

تصوّرِ اقبال

کی قرآنی بصیرت کا شاہکار تھی۔ یہ اقبالؒ ہی نے بتایا تھا کہ جمہوریت کا مغربی تصور اس برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی ابدی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دے گا اور اس سے ان کی حیاتِ ملی میں وہ حادثۂ قیامت رونما ہوگا جس سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اسی احساسِ زیاں کی پکار تھی جو مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کے مظاہروں اور جداگانہ مملکت کے قیام کے مطالبہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آئی اور یہی نصب العین تھا جو ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تجویز کیا۔ دس سال بعد پوری امت اس نصب العین کو اپنی جدوجہد کا مرکز و محور قرار دے چکی تھی۔ قائداعظمؒ کی قیادت میں سات سال کی مختصر سی مدت میں اس نئے جداگانہ مملکت کے قیام سے دنیا کے نقشوں کو بدل کر رکھ دیا اور تاریخ ایک نیا موڑ مڑنے پر مجبور ہو گئی۔

پاکستان کے محسوس و مشہود پیکر میں اقبالؒ کے فکر و بصیرت نے جس مملکت کو جنم دیا وہ محض جغرافیائی حد بندیوں کی آئینہ دار نہیں بلکہ وہ مظہر ہے اس انقلاب آفریں تصورِ حیات (IDEOLOGY) کی جسے خدا کا دین، تشکیلِ ملت کے لئے وجۂ اشتراک اور اساس قرار دیتا ہے۔ ایک طرف شیخ الہند کا نعرہ تھا کہ قوم وطن کی بنا پر تشکیل پاتی ہے اور دوسری طرف کروڑوں انسانوں کے قلب و نگاہ میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی اس تشدید قرآنی سے ایک نیا انقلاب ابھر رہا تھا کہ وحدتِ ملت کی بنیاد ایمان ہے۔ اشتراکِ وطن و نسل نہیں۔ اس انقلاب نے صدیوں کے بعد نوعِ انسانی کو ایک بار پھر اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ نظریاتی اساس پر کیونکر ایک مملکت وجود پذیر ہوتی ہے۔ صدیوں قبل حضور رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا اور ۱۹۴۷ء میں تاریخ پھر بصد اندازِ یکتائی اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

مملکتِ خداداد پاکستان کا وجود اقبالؒ کی اسی بصیرتِ قرآنی کا مرہونِ منت ہے۔ اس مملکت کے عظمت و جلال کے لہراتے ہوئے پھریرے اقبالؒ کی اسی بلند نگہی اور مومنانہ فراست کو خراجِ تحسین پیش کرتے دکھائی دے رہے ہیں اور اس انقلاب آفریں حقیقت کی شہادت بہم پہنچا رہے ہیں کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی موجود ہے جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے اپنے ہاں دینِ خداوندی کی عطا فرمودہ مستقل اقدارِ حیات کو قانون سازی کی اساس قرار دینے کے ایمان و اعلان کی بنا پر وجود میں آئی ہے۔ یہ سب کچھ اس حکیم انقلاب کے فکر و بصیرت کا جیتا جاگتا شاہکار ہے اور عصرِ حاضر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ۔

اسلامی مملکت کے واضح نشانات

اقبالؒ نے محض اس مملکت کے حصول کی نشان دہی نہیں کی، بلکہ تشکیلِ مملکت کے لئے ان اصول و اقدار کا بھی سراغ دیا جو قرنِ اوّل میں مملکت دین کی اساس بنے تھے۔

معاشی مسئلہ ایک مملکت کے نظام میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مملکتِ پاکستان کو پوری شدت سے اس مسئلہ کے حل کی ضرورت درپیش ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم کے نام ایک اہم خط لکھا اور اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

> یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دی جا سکتی ہے اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔

حضرت علامہ مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام سے مقصود یہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں قرآنی اصول و اقدار کی روشنی میں وہ معاشرہ متشکل ہو جس کے نشوونما سے شرفِ انسانیت کا محسوس نقشہ دنیا کے سامنے ابھر اور نکھر کر آجائے اور اس کے برگ و بار یہ ثابت کر دیں کہ نوعِ انسانی کو اپنی حقیقی ربوبیت کا سامان اگر کہیں سے مل سکتا ہے تو اسی بارگاہ سے۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ایک خط کے جواب میں وہ اس نظام کی عالم آرا اور انسانیت ساز خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ارتقائے شرفِ انسانیت

> اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور اس کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے اور کوئی اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ نبوتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نکلسن کے نام خط میں وہ اسلامی نظام کی خصوصیات کی مزید وضاحت فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ۔

> اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی تشو و ارتقا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد سیشن (۱۹۳۰ء) میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی تجویز پیش کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، اس میں اسلام کے پیش کردہ اجتماعی نظام کا امتیازی پہلو منظرِ عام پر لاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

> یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار دو سو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ اسلامی ریاست کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔

اور اسلام کے اس اجتماعی نظام کی متمیز حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

> اسلام بحیثیتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت سے کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور بحیثیتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور جو غیر اسلام ہو، نامعقول و مردود ہے۔

انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا۔

منزہ اسلام کی خاطر

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا۔ اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت و تعلیمات پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تحدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائینگے۔

علامہ مرحوم نے اس حقیقت پر زور دیا کہ اسلام کی روح اجتہاد کو از سرِ نو زندہ کرنا اشد ضروری ہے تاکہ حالات کے بدلے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر جزئیاتِ دین کی از سرِ نو ترتیب عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا تھا کہ

اجتہاد

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نکتۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ تقریباً تمام ممالک میں مسلمان اس وقت یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے)۔ ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں ..... غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

اسلامی نظام نوعِ انسانی کو جس شرف سے نوازتا ہے اس کی وضاحت علامہ مرحوم نے اپنے اس تاریخی خطبہ میں کی تھی جو "قومیت اور وطنیت" کے موضوع پر بحث کے دوران انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کو لکھا تھا۔ اس مکتوب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

انسان کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ باہمی آویزشوں، خونریزیوں اور خانہ جنگیوں کا ــــ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں

ہو سکتی ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کر انسان کا نصب العین قرار پا جائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ للعالمینی کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ للک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔

یہ ہیں اس شمعِ بصیرتِ قرآنی کی ضوفشانیوں کے چند مختصر سے گوشے جو اس حکیم انقلاب نے شبستانِ ملت میں روشن کی۔ یہ وہ گہر ہائے آبدار ہیں جن سے اس نے دامنِ ملت کو مالامال کر دیا۔ یہ وہ متاعِ فقیر تھی جو اسکے قافلے ہیں لُٹتی اور اسے سعد بختیوں سے ہمکنار کرتی گئی۔ سطح بین نگاہوں نے اسے محض شاعری سمجھا لیکن یہ شاعری نہیں تھی بلکہ خدا کی زندہ جاوید کتاب کی وہ دعوتِ انقلاب تھی جس نے صدیوں کی غلام اور از خود رفتہ ملت کو احساسِ خودی سے حیاتِ نو کا ذوق و شوق عطا کیا۔ یہ مایوس اور شکست خوردہ قوم اس بانگِ رحیل سے ایک نیا ذوقِ سفر لے کر اٹھی اور نشاۃ ثانیہ کی امنگیں اور عزائم سینے میں لئے آزادی اور استقلال کی حقیقی منزل پر جادہ پیما ہو گئی۔ اس کی منزل اقوامِ عالم میں سب سے انوکھی منزل تھی اور اس کا ذوقِ سفر امتیازی خصوصیت کا حامل۔

مقصد نہیں بلکہ ذریعہ

چند سالوں میں یہ کاروانِ شوق اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ منزل آخری منزل نہیں تھی۔ منتہیٰ و مقصود ایک خطۂ زمین کا حصول نہیں تھا، بلکہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں مقصود یہ تھا کہ وہ

> ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

• نورِ توحید کا یہ اتمام ؟ ابھی باقی ہے اور جب تک یہ ممکن نہ ہو اقبالؒ کی روح مطمئن اور مسرور نہیں ہو گی۔

اقبالؒ کا پیغام

نوجوانانِ ملّت کے نام

پروفیسر

[اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آج کا نوجوان طبقہ کل کی قوم ہوتا ہے۔ جس قسم کا یہ طبقہ اس قسم کی مستقبل کی قوم۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام کا اولیں مخاطب اس طبقہ کو قرار دیا۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر صاحب نے ۱۹۵۰ء میں ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا جس میں وضاحت سے بتایا تھا کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک "مسلمان نوجوان" کا تصور کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج اس پیغام کی اس وقت سے بھی زیادہ ضرورت ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں]۔ (طلوع اسلام)

بہت عرصہ کی بات ہے۔ میں کسی کام کے لئے عجلت میں تھا اس لئے بازار میں تیزی سے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے میرا کھوا چھل گیا۔ میں فوراً رکا اور اس مرد بزرگ سے معذرت چاہی۔ اس نے شفقت اور طنز کے ملے جلے لہجہ میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر کا تقاضا ہے۔ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آدمی تو ایک طرف دیواروں تک کو "ہونڈھے مار کر چلا کرتے تھے"۔ اس واقعہ کو ایک عمر گذر گئی لیکن اس پیر دانا کی بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جوانی کے زمانہ میں چونکہ فطرت کو قوائے جسمانیہ کی نشوونما مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ خون میں بجلیاں بھر کر رکھ دیتی ہے۔ جس سے نوجوان چلتا نہیں، دوڑتا ہے۔ اٹھتا نہیں، پھاندتا ہے۔ بیٹھتا بھی ہے تو کبھی نچلا نہیں رہتا۔ حرکت ــــ پیہم حرکت ــــ مسلسل حرکت ــــ یہ ہے جوانی کی نشانی۔ عمر کے ایک درجہ تک یہ سلسلۂ نشوونما جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترقی رک جاتی ہے لیکن اس کا عمل

علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے۔ پھر انحطاط کا زمانہ آجاتا ہے جو جوانی کی گردن فرازی کو کنوئیں جھکوا دیتا ہے اور انسان وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (بڑھاپے میں انسان کی حالت منکوس و منکوب ہو جاتی ہے) کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے۔

یہ تبدّل و تحوّل، انسانی جسم تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر بھی ہوتا ہے۔ جوانی میں جس طرح اس کا جسم، ساکت نہیں رہ سکتا اسی طرح اس کے خیالات بھی جامد نہیں رہتے۔ ان میں بھی ہر آن ایک تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ "نچلے نہیں بیٹھتے" کبھی یہ اسکیم سوچتے ہیں۔ کبھی اس پروگرام کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ ہونا چاہیئے، وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ خیالات کیا، کوندے کی لپک اور شعلے کی جھپٹ ہوتی ہے۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ جس نوجوان کو دیکھو یہی کیفیت کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد　　　دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے　　　تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے　　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ان خیالات کی یہی برق رفتاری اور شعلہ پائی ان میں محیر العقول (تحیر انگیز) انقلابات کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے صحیح کام لیا جائے تو قوم کی اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتی بلکہ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں سرکش و بیباک چھوڑ دیا جائے تو ان کا ماحصل ایک بگولہ کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ جوش و حرکت میں رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک نیا آسمان پیدا کر دے گا اور جب آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے تو زمین پر اپنا نقشِ قدم تک نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بعد، یہی نوجوان جو ابھی ابھی ایک شعلۂ جوالہ تھا، انحطاطِ عمر کے زمانہ میں، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے کہ جس میں نہ حرارت ہوتی ہے نہ حرکت، تبدیلیٔ احوال کے تصور سے اس کا دم گھٹتا ہے۔ انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی ہے۔ بے بسی کی قناعت اس کے نزدیک "شرافت کی زندگی" اور بے کسی کا سکون اس کے خیال میں بزرگی کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جمود و سکوت کی قبرستانی زندگی پر قانع ہی نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حرکت و جنبش اس کے نزدیک بچپن کی خام کاریاں، اور تیز خرامی و سبک سیری اس کے خیال میں جوانی کی تلون انگاریاں بن جاتی ہیں، پھر چونکہ عقل حیلہ جو، انسان کو جھوٹے فریب سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے وہ اس سکوت و جمود کی زندگی کو سنجیدگی اور ثقاہت کے بزرگانہ پیرہن میں پیش کر کے اس کی عدمِ حرکت کو تقدس کا جامہ پہنا دیتی ہے اور اس کے خیالات کے جمود و جمود کو تجربہ کی پختگی اور فکر کی تکمیل قرار دے کر اُسے "معقب" بنا دیتی ہے کہ

ساری دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے لیکن یہ اپنے مقام سے نہ ملے - فکر و نظر کا یہی تعطل جب مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو انسان اسے اسلاف پرستی اور تقلید آبا کا مقدس نقاب اڑھا کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے - (اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح بعض آدمیوں کے قوائے جسمانی اخیر عمر تک صحیح و سالم رہتے ہیں - اسی طرح ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جہاں انحطاط عمر کی برودت، انسانی خیالات کی حرارتِ انقلاب کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی - لیکن یہ صورتیں شاذ اور یہ شکلیں مستثنیات میں سے ہیں - کلیہ یہی ہے کہ من نعمرہ ننکسہ فی الخلق - عمر کی زیادتی سے حالت منکوس ہو جاتی ہے) - یہی وہ بڑے بوڑھے تھے جو صاحبِ ضربِ کلیم جناب موسیٰؑ جیسے کوہ تمثال و فرعون شکن داعیٔ انقلاب کی دعوتِ جہاد کے اولیں مخاطب تھے - ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انہیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے - اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ - لیکن ان پر عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریقِ مخالف کا خوف انہیں اس طرح چھلاوا بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ

"نہ صاحب! جب تک اس سرزمین میں بسنے والے وہاں موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں رکھیں گے،
تم اور تمہارا خدا جاؤ، اور ان سے لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں" (۵/۲۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ اس قانونِ مشیت نے جس میں کسی کے لئے رعایت نہیں ہوتی، فیصلہ کر دیا کہ اِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ (۵/۲۶) - یعنی جب ان کی یہ حالت ہے تو وہی سرزمین جو ان کے لئے مقدر کر دی گئی تھی ان پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ، اس بیابان میں سرگرداں پھرتے رہو - چنانچہ حضرت موسیٰؑ، ان چلتی پھرتی لاشوں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے - تا آنکہ اس قوم کے بڑے بوڑھے ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور وہ نوجوان، جن کی تربیت شہروں کی غلام ساز فضا سے دور، کوہ و بیابان کی آزاد ہواؤں میں ہوئی تھی، نئے دماغ، نئی زندگی، نئی آرزوؤں کو اپنے دلوں میں لئے حضرت موسیٰؑ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے - فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) یہی وہ آہن گداز نوجوان تھے جو انقلابی تصورات کو دماغوں میں لئے، بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا - نتیجہ یہ کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت ذلیل و حقیر سمجھی جاتی تھی، قوم غالب کے خزائن و دفائن اور تخت و تاج کی وارث بن گئی۔

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹئے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آ پہنچئے - آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت

بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجر ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی بساط بے نظام اور ہر فرد کارواں، ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ، فکر سے عاری۔ دل، سوز سے خالی۔ نگاہیں بے نور۔ قلوب بے حضور۔ قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبدء فیض کی کرم گستری نے اقبال جیسا مرد خود آگاہ و خدا مست اس قوم کو عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک کر ان میں حیات نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا، کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، فطرت کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق و معارف نے یہ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خون گرم کی حرارتیں، ان کا زور بازو، ان کا جوش کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیقِ نو، ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ

جواں مردے کہ خود را فاش بیند　　　جہانِ کہنہ را بازآفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش　　　کہ او با خویشتن خلوت گزیند

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے انہوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا در خورِ خطاب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے　　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ بے تابی سے بحضور رب العزت ملتجی ہوتے ہیں کہ ؎

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں | مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری | امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر | اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو یہی تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر اُبلے اور خیابانِ ملت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے۔ اسی لیے وہ دعا مانگتے تھے کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن | دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جوانان سہل کن حرفِ مرا | بہرِ شان پایاب کن ژرفِ مرا

تاریخی آثار و شواہد جو ان کے نورِ بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم | کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا | انگبیں جس کے جوانوں کو ہو تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگہ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جذام میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں ہیں۔ جوانی کے پہلے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے تنومند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔ اس لیے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی | لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل | نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی

یہی کجکلاہانِ ملت، قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ

ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تخلیق مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔ دیکھئے کہ وہ کس حسرت سے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ

نوجواناں تشنہ لب، خالی اباغ　　شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید　　چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود، مومن بغیر　　خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر

ان کی زندگی بے مقصد، ان کے افکار پریشاں، نہ کوئی متعین نصب العین نہ منتہائے نگاہ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی، اور مصافِ حیات سے گریز پائی۔

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ　　ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر　　آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام　　حریت اندیشۂ او را حرام
ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ　　نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

لیکن ان کی یہ تادیب، ایک طبیبِ مشفق کی تشخیص تھی۔ فیصلۂ عدالت کی تہدید نہیں تھی۔ ان کا ناوکِ تنقید ایک جراحِ غم خوار کی نوکِ نشتر تھی، فریقِ متخاصم کی سنانِ زہر آلود نہ تھی۔ ان کی تنبیہ مُلّا کی نفرت انگیز لاحول نہ تھی، مادرِ مہربان کی سیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجے پر پڑے۔ یہ قہر آلود نگاہیں غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدتِ غم سے آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتے تھے اور سسکیاں لے کر کہتے تھے کہ

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی　　یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انہوں نے اس لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ لٹی کیسے! جب تک یہ نہ بتایا جاتا اس کے تحفظ و بقا کا انتظام کیسے کیا جا سکتا تھا؟

تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالیئے۔ ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے گی۔ ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے، کمزور انسانوں کو اپنی ہوس کامجوئی کا ذریعہ بناتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعمال کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کارفرما رہی ہے۔ عہدِ جاہلیت میں چونکہ انسان کی عقلِ حیلہ جو نے ابھی ایسی پرکاری نہیں سیکھی تھی، اس لئے اس زمانہ کے اوزار و

اور ہتھیاروں کی طرح، محکوموں کو پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھُردرے اور کُند ہوتے تھے۔ جنہیں ہر آنکھ مشہود اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں، انسانی عقل مکر و حیل کی وضع و ساخت میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب کی طرح، مغلوب قوموں کو ضعیفی و زیر دستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب و ذرائع بھی لطیف و غیر محسوس ہوتے چلے گئے۔ ان تمام ذرائع میں، تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں، ان کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ بلا مزید سعی و کاوش، وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی۔ اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہو جائے گی کہ اس قوم کو پتہ تک بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی کی جا رہی ہے۔ جب ہندوستان میں انگریز آیا ہے تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس کے تغلب و استبداد کے راستہ میں روڑا بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے وہی غیر محسوس لیکن تیر بہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری کی پوری قوم بدل گئی۔

یہ تھی وہ قومِ غالب کی سحر آفرینی جو قومِ مسلم کی تبدیلیٔ احوال (بلکہ تبدیلیٔ فطرت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب میں وہ فرماتے ہیں۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
برّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویہ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسمان دیگر شود

تعلیم بدل جانے سے قوموں کی ریل گاڑی کا کانٹا مڑ جاتا ہے۔ کانٹا مڑنے سے جب ریل گاڑی پٹڑی بدلتی ہے تو دونوں پٹڑیوں میں غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے لیکن اگر کانٹا غلط موڑ دیا گیا ہو تو اس کے بعد پہیے کا ہر چکر گاڑی کو اس کی منزلِ مقصود سے دور لئے جاتا ہے۔ گاڑی کی حرکت بھی وہی ہوتی ہے اور رفتار بھی وہی۔ لیکن جب آخر الامر دیکھا جائے تو گاڑی اور اس کی اصلی منزلِ مقصود میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہی وہ غلط تعلیم

تھی جس نے اتنی سی مدتِ قلیل میں پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جانے اور پھر اپنا مقام پہچانے۔ انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اسی کا نام علمِ صحیح اور دینِ فطرت ہے۔ اگر یہ تعلق غلط خطوط پر متعین ہو جائے تو نظامِ انسانیت میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مغرب نے خدا، انسان اور کائنات کے اقنومِ ثلاثہ میں سے سب سے بڑا رکن (خدا) پہلے ہی الگ کر دیا۔ علمِ انسان کا منتہا، تسخیرِ فطرت کے رموز و اسرار بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مغرب کے تفوق و برتری کو ذہنوں پر مسلط کر دیا جائے اور اس جذبۂ مرعوبیت کے ماتحت ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اپنی ہر قدر سے نفرت ہوتی جائے اور حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت جھلکتی نظر آئے چنانچہ رفتہ رفتہ قوم کی یہ حالت ہو گئی کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے اُن کی قوتِ سماعت سے ہیں۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے ان کی بصارت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے اُن کی عقل کی روشنی سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹) انسان نہیں، انسان نما حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ نتیجہ یہ کہ ذہنوں میں افکار مستعار، دلوں کے مقاصد دوسروں کے پیدا کردہ، نگاہوں کے زاویئے اوروں کے متعین کردہ۔ زبان ان کی ہے بات اُن کی۔ چراغ ان کا ہے رات اُن کی۔ یہ تھی وہ تعلیم جس کے نتائج سے مردِ حق آگاہ کے کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی اور وہ اس آتشِ خاموش سے پھنک کر جس نے اس کے مغزِ استخواں تک کو جلا دیا تھا، بے اختیار کہتا تھا کہ

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود　　از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر　　از مقامِ او نداد او را خبر

وہ نوجوانانِ ملت کی چلتی پھرتی لاشوں کو دیکھتا اور نم آلود آنکھوں سے کہتا کہ

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے　　مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وہ جب ان مدعیانِ فرنگی کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی میناکاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہ جو درحقیقت اس کا خندۂ زخمِ پنہاں ہوتا تھا، ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پہ یہ ناز و تفاخر کس لئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ　　کہ تو وہاں کی عمارت گری کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے　　فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

احساسِ خودی اور خود نگہی، یہی شرفِ انسانیت کی اساس و بنیاد ہے۔ اور اس تعلیم سے اسی کو فنا کیا جاتا ہے

لہذا ظاہر ہے کہ حقیقت شناس نگاہ اس زہر ہلاہل کو کس طرح تریاق سمجھ سکتی ہے؟ اسی لئے وہ کہتے ہیں

بآں مومن خدا کارے ندارد　　　که در تن جان بیدارے ندارد

ازاں از مکتب یاراں گریزم　　　جوانے خود نگہدارے ندارد

یا بہ اسلوب دگر۔

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا　　　موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے　　　پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

وہ مکتب کے اس کارگہ شیشہ گراں کو بہ ہزار عبرت و تاسف دیکھتے اور جب انہیں نظر آتا کہ ان جوانانِ نیک طینت و پاک سیرت کو جن کے فولادی جوہروں کو شمشیرِ بے نیام بننا تھا، کس طرح جاپانی کھلونے بنایا جارہا ہے تو وہ اک صدائے دردناک و الم انگیز سے کہتے کہ :-

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے　　　سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

پھر اتنا ہی نہیں کہ تعلیم کے اس نظام سے محکوم قوموں کے افراد کی خودی کو ہی فنا کیا جاتا ہے بلکہ قیامت بالائے قیامت کہ قوتِ حاکمہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں رکھ کر محکوم قوم کے صالح عنصر کو اس درجہ اپاہج اور مفلوج بنا دیتی ہے کہ وہ معاش تک کے لئے ان کی دستِ نگر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ جی میں آئے ان سے بآسانی کرا لیا جا سکتا ہے۔ یہ انسانی ذلت و پستی کی وہ انتہا ہے جس کا احساس ہر قلبِ حساس کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اسی انسانیت کش منظر کو دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور درد و کرب کی انتہائی بے تابیوں کے ساتھ ایک آہ سرد بھر کر کہتے کہ

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے　　　نگاہ او چو شیراں بے پناہے

بمکتب علم میشی را بیاموخت　　　میسر نایدش برگ گیاہے

کس قدر قیامت ہے کہ خودی جیسی متاع بیش بہا کے بدلے ابنِ آدم کو روٹی کا ٹکڑا تک بھی میسر نہ ہو۔ اس کا سرمایۂ کونین چھین لیا جائے اور اس کے معاوضہ میں اسے دو وقت تک نہ مل سکے۔

نوا از سینۂ مرغِ چمن مُرد　　　زخونِ لالہ آں سوزِ کہن بُرد

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن بُرد

اسی لئے وہ اس نظامِ تعلیم و تربیت کو ملک الموت قرار دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں مدرسہ کے عنوان سے دیکھئے کہتے ہیں :-

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو — خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور اس کی ذمہ دار صرف وہی تعلیم نہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ وہ تہذیب ہے جو عصرِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے ساری دنیا کو یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

جواناں را بد آموز است ایں عصر — شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بداماں مثالِ شعلہ پیچم — کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ تہذیبِ مغرب کے اس قدر مخالف کیوں تھے! کیا یہ مخالفت مُلّا کی وہ قدامت پرستی تھی جس کی رو سے ہر نئی چیز دوزخ میں پھینک دینے کے قابل ہوتی ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک زندگی ایک جوئے رواں ہے جس کا کسی مقام پر بھی ختم جانا اس کی موت ہے۔ اس لئے جمود و تعطل ان کے نزدیک فطرت کے ضابطۂ قوانین میں جرمِ عظیم ہے جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ اس لئے وہ علمی عروج اور ذہنی ارتقاء کے کس طرح مخالف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا تہذیبِ مغرب سے ان کی مخالفت اور نفرت کی وجہ قدامت پرستانہ تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب باطل کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے ہر نگہِ حق شناس اس میں فسادِ آدمیت کا جہنم مضمر دیکھے گی اور اس کی مخالفت کرے گی۔ تہذیبِ مغرب کیا ہے اور یہ کس طرح باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے؟ حق کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں پر کس قسم کا قصرِ تہذیب تعمیر ہو سکتا ہے؟ ان سوالات کا جواب تفصیل طلب ہے، اس لئے اس مقام پر اس سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس اجمال کی تفصیل میری کتاب معارف القرآن کے صفحات پر پوری شرح و بسط سے پھیلی ہوئی ہے جس کا مطالعہ علومِ جدیدہ سے متاثر ذہنیتوں کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کسی قوم کی تہذیب درحقیقت اس کے فلسفۂ زندگی اور تصورِ حیات کی محسوس مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے جب ہم کسی قوم کی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تو دراصل یہ بحث اس قوم کے فلسفۂ حیات سے متعلق ہوتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کی بنیاد زندگی کے میکانکی تصور MECHANISTIC CONCEPTION OF LIFE پر ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی مادہ کے طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION) سے کسی نہ کسی طرح ظہور میں آگئی ہے اور جسمِ انسان ایک مشین کی حرکت سے اسے قائم رکھ رہا ہے۔ مرورِ زمانہ سے جب یہ حرکت بند ہو جائے گی تو زندگی ختم اور انسان نسیاً منسیا ہو جائے گا۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا

نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴)۔ (اور یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ ہم اب زندہ ہیں، عناصر کا شیرازہ بکھر جانے سے مر جائیں گے اور اس طرح مرورِ زمانہ ہمیں ختم کر دے گا)۔ لہٰذا انسانی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفرِ حیات کا کوئی منتہیٰ۔

در نگاہش آدمی آب و گل است — کاروانِ زندگی بے منزل است

اس تصورِ زندگی کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عزائم و اعمال کا معیار انفرادی اغراض یا زیادہ سے زیادہ افراد کے مجموعہ یعنی قوم کے مفاد کا حصول قرار پا گیا۔ مستحسن اعمال وہ جن سے افراد کو دولت و حشمت اور اقوام کو غلبہ و تسلط ہو جائے خواہ اس کے لئے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ جائز و ناجائز کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے لئے کسی اقتدارِ اعلیٰ (HIGHER AUTHORITY) کے سامنے جوابدہ ہو۔ یہاں افراد زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک جائز وہ جو قومی مفاد کا تحفظ کرے۔ قوم اپنے سے اوپر کسی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوتی اس لئے وہاں جائز و ناجائز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نظامِ تمدن و معاشرت کا فطری نتیجہ "جنگل کا قانون" ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس نظام نے دنیا کو کیا دیا؟ اس کے لئے اب کسی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ اور تو اور خود اس تہذیب و تمدن کے علمبردار اس کے ہاتھوں اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ وہ اس جہنم سے نکلنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں، لیکن انہیں نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ وَ مَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔ مشہور مفکر پروفیسر میسن (MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتداء سائنس کی کارگیری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں، زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل کچھ ایسے سہل نہیں۔

اور مشہور فرانسیسی مفکر (RENE GUENON) لکھتا ہے۔

> عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ اب ان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رک گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے...... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں...... مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوعِ انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔[1] (THE CIVILISATION OF THE MODERN WORLD)

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم"

غور کیجئے کہ اس تہذیب نو کے علمبردار خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالاں ہیں اور پھر سوچئے کہ جس دانائے راز کی فراست ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نے اس کے سامنے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا اس نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ

بیا کہ ساز فرنگ از نوا بر افتاد است — درونِ پردۂ او - نغمہ نیست فریاد است

یہ نتائج جن کو دیکھ کر یورپ کے مفکر اور اربابِ سیاست و تمدن یوں چیخ اٹھے ہیں، کوئی ہنگامی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ فطری نتیجہ ہیں اس تہذیب کا جس کی بنیادیں باطل پر استوار ہیں۔ چنانچہ تاریخ تہذیب کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی قانون جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

اس نہج زندگی اور آئینِ حیات نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ پر کیا اثر کیا؟ اس کے متعلق کسی مشرق کے دقیانوسی فرسودہ خیال کی زبان سے نہیں بلکہ مغرب کے روشن دماغ مفکر ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتا ہے۔

> ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلا تعین مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے، نہ آئینِ حیات، نہ اقدار ہیں، نہ معیار۔

اس بلا مقصد و معیار زندگی کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق مشہور فلسفی پسکال (PASCAL) نے لکھا ہے کہ

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے، اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب اسے ایمان اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلاء قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو برے راستے اسے خوش آتے ہیں۔

جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بدتر ہمارے نوجوان طبقہ پر گذری۔ یہ تھا وہ جہنم جس کے بچانے کے لئے حضرت علامہ نے نونہالانِ ملت کو پکارا اور اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر پکارا، کہ وہ غمگسارِ ملتِ شریفہ جانتا تھا کہ ان کی تباہی سے قوم تباہ ہو جائے گی اور ان کے سنبھلنے سے ملت کا مستقبل سنبھل

جائے گا۔ اس لئے اس نے نہایت محبت اور شفقت سے انہیں اپنے قریب بلایا اور کہا کہ

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما — اے جوانانِ عجم، جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام — تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
ہر دمے دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت — ریختم طرحِ حرم، در کافرستانِ شما
حلقۂ گردِ من زن اے پیکرانِ آب و گل — آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی تہی مائیگی سے واقف ہوں، میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس نہ سازِ دیرینہ ہے نہ ذرائع و اسباب۔ لیکن، یاد رکھو، قوم کی حالت، نگاہ کی تبدیلی سے بدلا کرتی ہے۔ خارجی انقلاب ہمیشہ دل کے انقلاب کا رہینِ منت ہوتا ہے اس لئے اسباب و ذرائع کی کمی اور متاع و منال کے نقدان سے مت گھبراؤ۔

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری — بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

پہلے اپنی نگاہوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ دل میں قوتِ ایمان، نگاہوں میں نورِ بصیرت، بازوؤں میں جوششِ کردار۔ سامنے حق و صداقت پر مبنی نصب العین اور دماغ میں اس کے حصول کا ولولہ۔ اس ساز و سامان کو لیکر نکلو اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی (۳۴/۴۶) اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصولِ منزل کی ابتدا کر دو۔

آفریدند اگر شبنم بے ما یہ ترا — خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند — پاسِ ناموسِ چمن دارد و خلیدن آموز
یا غباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا — صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز
تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی — در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

اس نے ان کے سامنے آئینِ فطرت کا یہ عظیم الشان راز فاش کر کے رکھ دیا کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت (کیرکٹر) پر ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس لئے انہیں حکم یقین تھا کہ

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور — قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

وہ انہیں مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس لئے انہیں متنبہ کرتا تھا کہ

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں — جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری　　　اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

وہ انہیں برملا کہتا تھا کہ قوموں کی تقدیریں سہل انگاری اور عافیت کوشی سے نہیں بدل جایا کرتیں۔ سلطنتیں ریزولیوشن پاس کرنے سے نہیں بلکہ ریز دلیوشن (عزم راسخ) پیدا کرنے سے ملا کرتی ہیں۔ تاج و شکوہِ خسروی کے معاملے مجلسِ چمن میں طے نہیں ہوا کرتے۔

تختِ جم و دارا سرِ راہے نفروشند　　　ایں کوہِ گراں است بکاہے نفروشند

با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

وہ جانتے تھے کہ غلط تعلیم و باطل تہذیب کے اثرات نے ان نوجوانوں کے جوہرِ مردانگی کو سلب، ان کے افکار کو آوارہ، ان کی نگاہوں کو پریشان اور ان کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ قوم کے اربابِ مسانید و فتاوی اور صاحبانِ دعوت و ارشاد کی توجہ اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مبذول کراتے اور ان سے بار بار تاکید کرتے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ　　　مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　　دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے　　　مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی　　　دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس لئے کہ ان کی پریشاں نظری دور ہو جانے سے ان کے سامنے وہ درخشندہ نصب العین حیات بے نقاب ہو جائیگا جس کا حصول ملتِ اسلامیہ کا منتہیٰ اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کی معراج ہے۔ نصب العین کی صداقت اور اس پر محکم یقین، انسان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کے جگر میں خون، خون میں حرارت اور حرارت میں وہ شعلہ صفتی پیدا ہو جاتی ہے جو باطل کے خس و خاشاک پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور اسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وہ "عقابی روح" ہے جس کی بیداری میں امتوں کی حیاتِ تازہ کا راز پوشیدہ ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　　نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　　　امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

حضرت علامہؒ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں شاہین کو مخاطب کیا ہے اس سے مقصود قوم کا جسور و غیور نوجوان ہی ہے۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے امکانات کی وسعتیں کس قدر حدود فراموش اور تحدید ناآشنا ہیں۔ دیکھئے یہ امیدوں کا شاہزادہ کس قدر شگفتہ و شاداب انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے　　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ تم کیا تھا؟ بس اسی میں اقبالؒ کے پیغام کا سارا راز مضمر ہے۔ مغرب اپنے موجودہ نظامِ تمدن و معاشرت کے ہاتھوں تنگ ہو گیا ہے لیکن چونکہ اس کے سامنے حقائقِ ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں اس لئے اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غارت گرِ امن و عافیت اور رہزنِ متاعِ شرفِ انسانیت تہذیب کی تخریب کے بعد، نظامِ انسانیت کو کن جدید بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لیکن حضرت علامہؒ کے سامنے تو حقائقِ ابدی کا وہ ضابطۂ آئین و دستور کھلا رکھا تھا جس میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اس لئے انہیں امتوں کے مرضِ کہن کا علاج تجویز کرنے میں کچھ دقت نہ تھی۔ انہوں نے مریض کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور اپنے یقین کی پختگی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی　　　علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ملت کی کشتِ ویراں کا نم۔ اسی آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہونا تھا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ملت کے نوجوانوں سے پوری قوت اور شدت سے کہا کہ یورپ آوارہ نظر اور پریشان نگاہ ہے اس لئے تمہیں اس کی تقلید سے کیا حاصل ہو گا۔ تمہارے صحنِ چمن میں تو تہذیب و تمدن کا وہ شجرِ طیب سایہ فگن ہے جس کی جڑیں حقائقِ ابدی کی گہرائیوں میں اور جس کی شاخیں کہکشاں گیر ہیں۔ شجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا اور شرق و غرب کی ثنویت سے بے نیاز ہے (لا شرقیۃ ولا غربیۃ) جس کے برگ و بار کی تازگی و شگفتگی پر ہزار جنتیں نچھاور اور لاکھوں بہاریں تصدق ہیں اور جسے دیکھ کر باغبانِ فطرت فرطِ مسرت سے والہانہ انداز میں جھوم اٹھتا ہے اور حاسدوں کے دل پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار (۴۸:۲۹) تم اس سدا بہار شجرِ مقدس کی شاخ سے گر پڑے ہو۔ تمہیں تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پھر سے اسی شاخ سے پیوستہ ہو جاؤ۔ زندگی کی تمام تر و تازگیاں تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی اور کامیابیوں کے پھول اور کامرانیوں کے خوشے اس کا ماحصل ہوں گے۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی

بس اس کے لئے کرنا یہ ہے کہ مغرب کی باطل افروز تہذیب اور انسانیت سوز نظریۂ زندگی کا جو زنگ تمہارے قلب و نظر کو آلودہ کر چکا ہے اسے الگ کر دو۔ یہ حصہ لا الٰہ ہے۔ اس کے بعد اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دو کہ قرآن تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ حصہ الا اللہ ہے۔ لا اور الا کے اس مجموعے سے تمہاری داستانِ حیات نئے سرے سے مرتب ہو جائے گی۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو　　　مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو

اس ایمان سے تمہاری نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا اور جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا تو ساری دنیا بدل جائے گی۔ یہ ہے اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام۔ وہ پیغام جسے انہوں نے پیامِ مشرق میں "بندِ باز با بچۂ خویش" کے اشعار میں

ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ شاہیں اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ

تو دانی کہ بازاں زیک جوہر اند — دلِ شیر دارند و مشتِ پر اند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش — جسور و غیور و دلاں گیر باش
میا میز با کبک و تورنگ و سار — مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
شد آں باشہ نخچیر نخچیرِ خویش — کہ گیرد ز صیدِ خود آئینِ خویش
نگہ دار خود را و خورسند زی — دلیر و درشت و تنومند زی
چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب — کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعلِ ناب
ز دستِ کسے طعمہ خود مگیر — نکو باش و پند نکو یاں پذیر

قوم کے جس نوجوان میں یہ سیرت فولاد پیدا ہو جائے وہی قوم کی امیدوں کا سہارا اور اس کے آسمانِ مستقبل کا درخشندہ ستارہ ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضربتِ کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز — کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

(اپریل - ۱۹۶۹ء)

خوشخبری

پروفیسر صاحب کی مقبول کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" ایک عرصہ سے کمیاب بلکہ نایاب تھی، اور اس کے لئے مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہو رہے تھے۔

مقامِ مسرت ہے کہ وہ کتاب آجکل پریس میں ہے اور امید ہے کہ بہت جلد شائع ہو جائے گی۔

ناظم

سرسیدؒ - اقبالؒ اور قائداعظمؒ

کاروانِ ملت کے عظیم سالار

۲۱ اپریل حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا یوم وفات ہے اور ۲۳ مارچ تاریخِ ملت میں وہ عظیم دن جب قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان کی قرار داد پیش کی۔ ہم ان ہر دو یادگار تقاریب کی یاد، اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تذکرۂ جلیلہ سے منانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ داستانِ زریں نامکمل رہ جاتی ہے اگر اس میں اس کا افتتاحیہ۔ شامل نہ کیا جائے۔ اور وہ افتتاحیہ ہے سرسید (علیہ الرحمۃ) کا تذکرہ۔ یہ مقالہ جو اس سے پہلے بھی زینتِ دہ اوراقِ طلوعِ اسلام ہو چکا ہے پیشِ خدمت قارئین ہے۔ (طلوعِ اسلام)

انیسویں صدی (عیسوی) کا آغاز ہو چکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا جاہ و جلال آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستانِ زوال مایوسی و شکست کے ان مراحل سے دوچار ہو رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قومی زوال اور شکست کی یہ تاریک رات عہدِ رفتہ کی سمت میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطانی اور ملوکیت "ظل اللہ" کا لبادہ اوڑھ کر، اور اسلام کی محافظت کر آئی تھی۔ دینِ خدا کو دینِ استبداد میں اسی نے تبدیل کیا تھا۔ اس کی عطا فرمودہ آزادیٔ فکر و نظر پر خوف و ہراس کی تعزیریں اسی نے قائم کی تھیں۔ انسانی حریت و مساوات کی جنتِ ارضی اسی کے ہاتھوں زیر و زبر اور پامال ہوئی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی متاعِ حیات راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور جب مغلوں کے زوال کے بعد یہاں یونین جیک کی پرچم کشائی کا دور آیا تو مسلمان کی رگِ حیات اس خونِ گرم سے بے نصیب ہو چکی تھی جس کی حرارت نے اسے مدت تک ذوقِ سفر سے سرشار اور سرگرم

تگ و تاز رکھا تھا۔

ایک صدی پہلے

۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند شدتِ جذبات کی آخری بھڑک ثابت ہوئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کارگہِ سیاست کے شکست خوردہ مسلمان نے مرغِ بسمل کی آخری تڑپ سے کام لیا اور اپنی ناتوانیوں کے باوجود لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نئے اور طاقتور حکمرانوں کو دعوتِ پیکار دیتا میدان میں نکل آیا۔ لیکن یہ جراتِ رندانہ اسے بہت مہنگی پڑی۔ عقلمند شاطرانِ فرنگ کی عقابی نگاہیں اس حقیقت کو بھانپ چکی تھیں کہ جب تک یہاں کے مسلمانوں کو ان کے قومی تشخص اور احساسِ خودی سے کلیتہً محروم نہ کر دیا جائے، ان کا شاندار ماضی راکھ کے ڈھیروں سے غیرت کے شعلے بھڑکاتا رہے گا۔ وہ اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے —— جذباتی طور پر ہی سہی، حرکت میں آتے رہیں گے اور غیر ملکی حکمرانوں کو تشنہ خطروں سے دوچار رکھیں گے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے ہندوؤں کو اپنی آغوشِ شفقت و مرحمت میں لے لیا اور مسلمانوں کے ملی وجود کی رہی سہی حرکت کو ختم کرنے کے لئے جوشِ انتقام کا ہر ممکن حربہ بروئے کار لانا شروع کر دیا۔ آقایانِ فرنگ کی سرپرستی میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر برادرانِ وطن دیوانہ وار دفتری نظام کیطرف بڑھ رہے تھے اور وہ مسلمان جس نے ایک ہزار برس تک اس برصغیر میں اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا تھا، اب نئے حکمرانوں کی آتشِ انتقام میں اپنی متاعِ حیات کو بھسم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ محکومی و مظلومی، غربت و افلاس، بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے ہر چہار اطراف سے اسے اپنے حصار میں لے چکے تھے۔ اس کی زندگی کے قبرستانوں میں چاروں طرف مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دم توڑتی قوم اس عالمِ سکرات میں ایک بار پھر کارگہِ حیات میں صف آرا ہو سکے گی۔ اور مورخ کا قلم اس کی نشاۃِ ثانیہ کی داستان تاریخ کے صفحات پر رقم کر سکے گا۔

۱۸۵۷ء میں ہم اپنی قومی زندگی کے نازک ترین مقام پر کھڑے تھے۔ کوئی معجزہ ہی ہمیں اس اندوہ ناک موت کی زد سے بچا سکتا تھا جو تیزی سے ہمارے دروازوں کیطرف بڑھے چلی آ رہی تھی۔ لیکن قوموں کی موت و حیات کے قوانین کی معجز نمائیاں بھی کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ یہ معجزہ بالآخر نمودار ہوا اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ہم کس طرح زوال اور شکست کے افق میں ڈوب کر پھر آزادی و استقلال کے مطلع پر صورتِ خورشید ابھر آئے۔ کسی قوم کا زوال اور شکست کی ہچکیوں سے نجات پا کر ازسرِ نو زندگی سے ہمکنار ہونا معمولی بات نہیں۔ بڑی ہی خوش نصیب ہے وہ قوم جسے یہ شرف حاصل ہو جائے۔ اور مستحقِ تبریک ہیں وہ دانیانِ انقلاب جن کی دعوتِ انقلاب ایسے معجزوں کی امین ثابت ہو۔

اشاعتِ زیرِ نظر میں ہمارا موضوع اپنی اسی نشاۃِ ثانیہ کی گرانمایہ یاد کو تازہ کرتے ہوئے ان

جلیل القدر زعماء کے مقام و پیام کو قارئین کے سامنے لانا ہے جو ہمارے سفینۂ حیات کو بھنور سے بچا کر ساحلِ مراد تک لے آئے اور ان کے عزم و استقلال اور دعوتِ انقلاب نے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کے دوش بدوش گامزن ہونے کے قابل بنا دیا۔ تاریخ بتائے گی کہ زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم و جلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہمارے سروں پر آزادی کا ہلالی پرچم سایہ فگن نہ ہوتا بلکہ اغیار کی غلامی اور محکومی میں ہماری بے بسی اور بے چارگی صفحۂ تاریخ پر ذلت اور شکست کا بدنما داغ بن کر ثبت ہو جاتی۔

زعیمِ اوّل ـــــ سرسیّد احمد خاںؒ

ہماری نشاۃ ثانیہ کی اس داستان میں سرسید علیہ الرحمۃ کی نادر الوجود شخصیت نقیبِ اوّل کی حیثیت سے اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ وہی سرسید جو کنکوے اُڑاتا اور صدر امینی کے دفتر میں معمولی سررشتہ دار کی حیثیت سے کام کرتا مرکزی لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت تک پہنچا۔ اور پھر اس کے بعد وقت کے تقاضوں پر لبیک کہتا ہوا، سارے اعزازات کو بالائے طاق رکھ کر، اس جذبۂ جنون اور عزم و استقلال کے ساتھ میدانِ عمل میں آیا کہ اس کے جوشِ عمل نے اس برصغیر کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اور ملتِ اسلامیہ اپنے عزّ و شرف کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ پانے کے قابل ہو گئی۔ شہرۂ آفاق ترک خاتون خالدہ ادیب خانم نے اس زعیمِ ملت کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کس قدر درست کہا تھا کہ

> سرسید کو کسی پہلو سے بھی دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا بھاری پتھر تھا جو اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا اور اس نے جو لہریں پیدا کیں وہ آج تک برابر حرکت میں ہیں خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جسے سرسیّد پسند کرتے تھے۔
>
> (مقدمہ حیاتِ جاوید) (بحوالہ علیگڈھ میگزین)

عقل و فکر کی دعوت

سرسیّد قومی زوال اور شکست کے جس ماحول میں مردانہ وار آگے بڑھے آج اس کا صحیح صحیح جائزہ لینا اور اندازہ لگانا آسان نہیں۔ جذبات کے دھاروں پر بہتے ہوئے سرسیّد کو اندھا دھند ہدفِ تنقید بنایا جا سکتا ہے اور بعض گرم جوش حلقے آج بھی ایسا کھیل کھیلنے پر نازاں ہیں لیکن ہے کوئی جو علیٰ رؤس الاشہاد اس کا جواب دینے کی جرأت کرے کہ اگر سرسیّد کا عزم و فراست اور خالص عملی اندازِ فکر اس نازک اور کڑے وقت پر اپنی قوم کو پیشِ نظر حقائق پر سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت نہ دیتا تو آج ہمارا حشر کیا ہو چکا ہوتا؟

مشہور برطانوی مدبر ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی شہرۂ آفاق انگریز کتاب "انڈین مسلمانز" میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اس نے انگریز حکمرانوں کے دلوں میں غیض و غضب کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی طبعی دشمنی ثابت کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر نے اپنے جوشِ بیان میں تحریر کیا تھا کہ

مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔
اور کسی بھی طرح گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں بن سکتی۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں علمائے اسلام سے ایک استفتاء کیا تھا اور حالات اس قدر نازک تھے کہ کسی سے اس کا دو ٹوک جواب دینے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر ہنٹر کا سوال یہ تھا کہ

اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو کیا اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی اعانت ترک کرنی اور غنیم کی امداد کرنی جائز ہوگی؟

حق گوئی و بے باکی

سوچئے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند کے بعد جب کہ دلوں پر خوف و ہراس کے پردے بٹھا دیئے گئے تھے اور زبانوں پر سکوت کی مہریں لگ چکی تھیں، اس نازک سوال کا سکت اور دو ٹوک جواب کس طرح اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس سوال کا جواب دیا گیا۔ یہ صرف سرسید علیہ الرحمۃ تھے جنہوں نے جواباً ہر خوف سے بے نیاز ہو کر "آئینِ جوانمرداں" کی لاج رکھی اور گرج کر کہا کہ

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کو کسی بڑے ہنگامے میں قوم کا کیا حال ہوگا۔ لیکن میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کچھ کریں گے جو ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرائے گی۔

اور حکمرانوں کے دلوں نے شہادت دی کہ سچے مسلمانوں کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کو جس قیامت سے گزرنا پڑا، اس نے سرسید کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں ان کے ایک دوست کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے سرسید کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی گرنے نے"۔ حالات گواہ ہیں کہ ملت کا جو حشر ہوا اس نے ہمیشہ کے لئے سرسید کی زندگی کا سکون اور اطمینان چھین لیا اور اس کے بعد قوم کو موت سے بچانے کے لئے وہ ساری زندگی آتش زیر پا رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء) میں انہوں نے خود اپنی تقریر میں کہا تھا۔

میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سرِ نو عزت پانے کے قابل

ہو جائے گی ..... آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بوڑھا کر دیا، اور میرے بال سفید ہو گئے۔

جُداگانہ منزل

مسلمانوں نے جس مقصد عزیز کے لئے غیر ملکی سامراج کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا تھا۔ اس کا تعلق محض ان کی اپنی آزادی سے نہیں تھا بلکہ وہ پورے برصغیر اور برادرانِ وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اس راہ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو حکومت کے تند و تیز انتقام کا شکار بننا پڑا، تو برادرانِ وطن نے کلیتہً آنکھیں پھیر لیں۔ وہ نہ صرف دفتری نظام میں حکومت کے دست و بازو بن گئے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے خلاف محاذ کھڑا کر لیا۔ سرسیدؒ نے کم و بیش دس برس تک انہیں محبت اور رواداری سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب دیکھا کہ اس کا الٹا اثر ہو رہا ہے اور (اور تو اور) اُردو زبان کو مٹانے کے لئے محض اس لئے پنجاب سے بنگال تک فتنہ برپا کر دیا گیا ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے دورِ اقبال کی یادگار ہے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ منزلِ مقصود کے لئے سامانِ سفر باندھنا چاہیئے۔ ان کی آواز پورے ملک میں سنی گئی جب کہ انہوں نے کہا کہ

> مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب اُبھرتا جائے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا دیکھ لے گا۔ (حیاتِ جاوید)

سرسیدؒ نے یہ الفاظ ۱۸۶۷ء میں بنارس میں مسٹر شیکسپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کہے تھے۔ اس پیشین گوئی کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے کہ اسّی برس کے اندر اندر یہ الفاظ کیونکر قاضیٔ تقدیر کا اٹل فیصلہ بن کر محسوس و مشہود اور جیتی جاگتی تاریخی حقیقتوں میں ڈھل گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس داستان کا آخری باب تکمیل پا گیا۔

قومی تعلیمات کا تعمیری مرحلہ

۱۸۶۷ء میں سرسیدؒ نے اپنے جداگانہ قومی مستقبل کی جزئیات متعین کر لی تھیں۔ ان کے ذہن میں اس تعمیرِ ملی کے خاکے ترتیب پا رہے تھے۔ افرادِ ملت کی تعلیم و تربیت اور ان کے فکر و شعور کا نشو و ارتقاء ان کے تعمیری منصوبوں کی اساس قرار پا چکا تھا۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے حالات کی انتہائی ناسازگاری میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر علی گڈھ کے اس فقید المثال دار العلوم کی تعمیر میں منہمک ہو گئے جہاں سے ایک افسردہ و پژمردہ قوم کے نونہال ستارے بن کر اُبھرے اور اس کا افقِ تقدیر ایک بار پھر ان ستاروں کی تابانیوں اور ضوفشانیوں سے جگمگا اُٹھا۔

قومی تعلیمات کے اس مرکزِ عظیم کی تعمیر و ترقی کے جنون میں سرسیدؒ نے کس طرح اپنی جان لڑا دی

یہ ایک الگ داستان ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہ اس سے قبل پیدا ہو سکی اور نہ شاید اس کے بعد ہو سکے۔ اس دور کے تعلیمی کمیشن کے چیئرمین مسٹر وارڈ نے جب پہلی بار اس دارالعلوم میں قدم رکھا تو اپنی ڈائری میں اس نے تحریر کیا کہ

> جس وقت میں نے ان کمروں کی قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی عمدہ ترین عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو۔ جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر سکتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔

(حیاتِ جاوید)

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے سرسیدؒ کی وفات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کے اسی شاہکار کی طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ

> جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں وہ اس قدر مفلس تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو، لیکن وہ آپ کے لئے ایک گرانمایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشانِ منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔ (حیاتِ جاوید)

وحدتِ خیال کا مرکز

علی گڑھ کے اس عظیم الشان دارالعلوم کا مقصد محض نئی نسل کی تربیت نہ تھا بلکہ اس سے کہیں آگے تھا۔ ہمارے نامور ادیب صلاح الدین احمدؒ کے الفاظ میں سرسیدؒ کی دوربین نگاہوں کے سامنے اس سے کہیں اہم منزل کچھ اور تھی اور وہ یہ کہ

> وہ علیگڈھ کو مسلم لیڈرشپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دُوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائینگے اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیط کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے زمانے کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا..... چنانچہ علیگڈھ کو انہوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور بیداری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچکر اثر آفرین ثابت ہوئیں۔

(مقالہ سرسید احمد خانؒ پر ایک نظر)

سرسید کا عظیم مشن ان الفاظ سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو انہوں نے طلبائے دارالعلوم سے ایک خطاب

کے دوران میں کہے تھے۔ انہوں نے اپنے شاہی بچوں پر واضح کیا تھا کہ

> یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر تم اگر آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا! مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ثابت ہو گے اور تبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔

(حیاتِ جاوید)

اسلامی قومیت کا وجود کیونکر وطن، رنگ اور نسل کی بجائے آئیڈیالوجی اور صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پر عمل میں آتا ہے اور عقیدہ ایمان کی نظریاتی اساس پر مسلمان کیونکر ایک الگ قوم و ملت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں شاید یہ اس دور کی پہلی آواز تھی جسے قومی تعلیمات کے اہم ترین جزو کی حیثیت سے نئی نسل کے ذہن نشین کیا گیا۔ یہ تصور تھا جو نوجوانانِ ملت کے قلوب میں بویا گیا اور نظریہ پاکستان کی کونپلیں بن کر آہستہ آہستہ برگ و بار لایا۔

خلوص و ایثار کا مظہر

یہ تھا جداگانہ اسلامی قومیت کا وہ بیج جو علی گڑھ میں بویا گیا۔ اس کی تربیت اور نشوونما کے ممکن مواقع بہم پہنچائے گئے۔ اسی کے لئے وہ ذہنی جمود توڑا گیا جس کے مذہبی اجارہ داروں نے اس زعیم کے خلاف کفربازی کا طوفان برپا کر دیا۔ لیکن یہ طوفانِ باد و ہو سرسیدؒ کو اس کے مقصدِ عزیز سے جدا نہ کر سکا۔ مخالفت کے اسی طوفان میں انہیں پنجاب کے مسلمانوں سے (لاہور میں) خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک تاریخی خطاب تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ زعیم قوم نے اپنے دل کے زخم بے نقاب کر کے زندہ دلانِ پنجاب کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ بڑی دل سوزی سے اس نے کہا تھا۔

> بزرگانِ پنجاب! فرض کیجئے کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خیرخواہ اور خادم نہیں سمجھیں گے؟ آپ کی دولت سرا بناتے ہیں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنا گھر بنتے دیکھئے۔

(حیاتِ جاوید)

سرسید کا یہ خطاب کس قدر اثر انگیز تھا، مولانا حالی اس کا چشم دید خاکہ "حیات جاوید" میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "یہ سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم طاری تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے بڑھ کر چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو ...... یہی الفاظ جو آج معمولی باتیں معلوم ہوتے ہیں، اس موقع پر جب سرسیدؒ کی زبان سے نکلے تھے تو ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا تھا۔"

فکری جمود کے خلاف جنگ

سرسیدؒ ہر قیمت پر صدیوں کے قومی جمود توڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک قوم میں یہ احساس نہ پیدا ہو گی کہ وہ مسلک تقلید کی زنجیریں توڑ کر نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق سفر زندگی شروع کر سکے۔ اس وقت تک عظمت رفتہ کی باز آفرینی کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ جہاں انہوں نے قلوب و اذہان میں نئی روشنی پیدا کرنے کے لئے مرکز تعلیمات پر پوری توجہ مرکوز کی وہاں تحریروں اور تقریروں کے ذریعے قومی فکر و بصیرت اور اجتماعی شعور کو بھی جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ اس راہ میں انہیں مذہبی اجارہ داروں کی مخالفت کی جس شدت سے دوچار ہونا پڑا، اس نے ماضی کے سارے ریکارڈ مات کر دیئے۔ ان کے خلاف ہزاروں کی تعداد میں جو فتوے شائع ہوتے ان میں اس گراں مایہ نعیم کو شیطان ابلیس لعین اور دجال تک کہا گیا۔ اس کا قتل واجب قرار دیا گیا۔ لیکن اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

ان فتووں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی نے کس قدر درست کہا تھا کہ

> درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں بلکہ سرسیدؒ کے اعلیٰ درجے کے مسلمان ہونے کے دستاویز ہیں۔ یہ تمغے انہیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ (حیات جاوید)

کیا تعصب کے یہ شاہکار اس داعیٔ انقلاب کی عظمت کو داغدار کر سکے؟ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ سرسیدؒ نے اپنے مقام بلند سے ہمیشہ یہ سب کچھ مسکراتے ہوئے سنا۔ اور اس کی روشن پیشانی پر کبھی شکن تک نہ ابھری۔ اس کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس سے دشمنی کے باوجود برادران وطن کے دلوں میں ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ اے کاش! ان کے ہاں بھی کوئی سرسیدؒ ہو۔ حیات جاوید میں مولانا

ذکاء اللہ کی تحریر کے حوالے سے الہ آباد کے جلسہ عام میں ایک فاضل پنڈت کی تقریر کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں کہا گیا تھا کہ

> ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں۔ تعلیم میں فائق ہیں۔ تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں لیکن افسوس کہ ہم میں کوئی سرسیدؒ نہیں۔ بلکہ ہم میں سے ۲۰ بیس مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سرسیدؒ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔

حکیم انقلاب ـــــ علامہ اقبالؒ

اُنیسویں صدی کے آخر میں سرسیدؒ ہم سے رخصت ہو گئے اور ایک ایسی قوم پیچھے چھوڑ گئے جس کے نونہالوں کے سینے قومی تعلیمات سے منور ہو رہے تھے۔ اس کے مسلکِ تقلید اور قدامت پرستی کے سانچے آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے تھے اور ذہنی جمود کی برفانی سِلوں نے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ درست تھا۔ لیکن جہاں تک ملّت اسلامیہ کی ذہنی نفسیات کا تعلق ہے، یہ مقام ہماری حیاتِ اجتماعی میں بڑا ہی نازک مقام تھا۔ قوم روایات کہن کی پرستش گاہوں سے نکل کر آزادیٔ افکار کی کھلی فضا میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے احساسات کی جمود انگیزیوں نے اب صورتِ سیلاب اختیار کر لی تھی۔ اس کے خوابیدہ افکار نے کشمکش اضطراب سے دوچار ہونا تھا۔ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ تھا کہ افکار و احساسات کی شوخیاں اپنے بند توڑ کر بے باکی اور سرکشی پر نہ اتر آئیں۔ انہیں زندگی کی مستقل اقدار کے ساحلوں میں پابند رکھنا اشد ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ جو قوم آئیڈیالوجی کے اشتراک پر زندگی کی گزرگاہوں کو طے کرنا چاہتی تھی اس کے لئے ان اقدار کا سرچشمہ خدا کی آخری کتاب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

سرسیدؒ کی موت کے بعد کم و بیش پچیس برس تک قومی زندگی کا میدان ایسے حکیم انقلاب سے خالی رہا جو تقاضائے وقت کی اس پکار کا جواب دے سکے۔ قوم ایسے دانائے راز کی منتظر رہی جو ان اقدارِ حیات کو درجِ اسلام سے کشید کرے اور انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق عصرِ حاضر کی زبان اور الفاظ میں افرادِ ملت کے ذہن نشین کر سکے۔ سرسیدؒ کے بعد ربع صدی کا قیمتی عرصہ اسی محرومیٔ انتظار میں گزر گیا۔ اسی دوران میں من حیث القوم اپنی منزل کا تعین کئے بغیر مسلمان برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر جذباتی تحریکوں میں مایوسیوں اور نامرادیوں کا شکار رہتے رہے اور پھر وہ دن آیا جب کہ مایوسیوں کی اس تاریک رات میں ایک چراغ روشن ہوا۔ اور یہ آواز سنائی دی۔

اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

حکیم انقلاب کی دعوت قرآنی

یہ حکیم انقلاب علامہ اقبالؒ کی آواز تھی جو شرق و مغرب کے علمی میکدوں سے نامراد لوٹا تھا اور قرآن کے بابِ عالی پر دستک دی تھی۔ اور یہاں سے مالا مال ہونے کے بعد اُس نے قوم کو جوشِ مسرت سے پکارا تھا کہ

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

اور پھر واضح کیا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور قومی ذلت اور نامرادیوں کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

زندگی کی عظیم حقیقتوں کی یوں نقاب کشائی کرتا یہ دانائے راز ایک دعوت لے کر آگے بڑھا۔ یہ قوم کی بگڑی بنانے کی دعوت تھی۔ مردانہ وار کارزارِ حیات میں رزم آرائی کا پیغام تھا۔ کسقدر سوز و ساز، تڑپ اور خلش مضمر تھی اس دعوت میں جب اُس نے کہا۔

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
فشارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

یہی وہ مبارک و مسعود شخصیت تھی جسے مبدأ فیض کی کرم گستری سے وہ قرآنی بصیرت عطا ہوئی جس نے ہر کٹھن مرحلے پر ملت کے لئے نشانِ منزل اور قندیلِ راہ کا کام دیا۔

اسلامی قومیت کا تصوّر

علامہ اقبالؒ اپنے مقام سے بخوبی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ عملی سیاسیات میں قوم کی رہنمائی ان کے طبعی رجحان سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ان کا مقام ایک عظیم القدر مفکر کا مقام ہے، اور اسی مقام سے وہ قوم کو اس کی حقیقی منزلوں کا سراغ

دے سکتے ہیں۔ ایک مفکرِ اسلام کی حیثیت سے انہوں نے سب سے پہلے جس سیاسی مسئلہ کی اہمیت کو بھانپا وہ قومیت کا مروجہ مغربی تصور تھا۔ یہ تصور اسلام کے اس نظریۂ قومیت سے براہ راست متصادم ہوتا تھا جس کی رُو سے قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہوتی ہے، نہ کہ وطن، رنگ یا نسل کی اساس پر۔ مزید برآں علامہ اقبالؒ ان ہولناک نتائج سے بھی پوری طرح باخبر تھے جو قومیت کے مغربی تصور کو قبول کرنے کی بنا پر ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کو لاحق ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے یہی نعرۂ جہاد بلند کیا کہ وطن مسلمانوں کی قومیت کی اساس نہیں بن سکتا۔ انہوں نے پوری قوت سے یہ آواز بلند کی کہ

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی ہے روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطنی قومیت کے اس بُت کو جس کے حضور میں بڑے بڑے فقیہانِ حرم سجدہ ریز نظر آتے تھے، ضربِ کلیمی سے یُوں پاش پاش کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہہ کر اپنی ملت کو اس کے گم گشتہ مقام سے خبردار کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

نیشنلزم کے دلفریب سومنات کے چنگل سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے لئے اس حکیم انقلاب کی صدائیں برابر اس برصغیر کی فضا میں گونجتی رہیں۔ وہ اپنوں اور بیگانوں، سب کو ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی کی اصل حقیقت سے روشناس کراتے چلے گئے اور پوری بلند آہنگی سے انہوں نے نعرہ بلند کیا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

پھر ایک دن ان کی نگاہوں نے یہ جگر پاش منظر بھی دیکھا کہ چوٹی کے علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین اپنی ملت کو نیشنلزم کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس قیامت پر آنسو بہاتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے انہوں نے یوں نوحہ خوانی کی۔

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند اینجا پرستد مومن و کافر تراشد

یہ مسکیاں اور ناشکیبائیاں ابھی رکی نہ تھیں کہ بدایوں کی جامع مسجد کے منبر سے شیخ الہند کا یہ نعرہ بلند ہوا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" ایسا نظر آتا تھا کہ ایک چوٹی کے عالم دین کا برسر منبر یہ اعلان ایک نشتر تھا جس نے بستر مرگ پر سسکتے ہوئے حکیم انقلاب کا سینہ چھلنی کر دیا۔ اس کے قلب ونگاہ کی گہرائیوں میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آہ آتشیں کی صورت میں یوں لبوں تک آئی۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اور اس کے بعد ان کا جو تاریخی بیان منظر اشاعت پر آیا اُسے "معرکۂ دین و وطن" میں ہمیشہ ایک شاہکار کی حیثیت حاصل رہے گی۔

بانگ رحیل ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ الٰہ آباد) کی مسند صدارت سے ملت کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ خطبۂ صدارت ہماری تاریخ میں ایک سنگ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گنگ وجمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر ایک حکیم انقلاب نے قوم کو اس کی گم گشتہ منزل مقصود کا سراغ دیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ خطاب ایک اذان سحر تھی جو فضاؤں میں گونجی اور اسے سن کر خوابیدہ قوم انگڑائیاں سی لینے لگی۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

"ہندوستان کی تاریخ میں جو نازک وقت آج مسلمانوں پر آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدت افکار وعمل پیدا کرکے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملت اسلامیہ اور ہندوستان، دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔ ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس ملک کو اظہار خودی کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کے فیض سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ جس سرزمین کے ساتھ ہماری زندگی اور موت وابستہ ہو چکی ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک فریضہ عاید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر ایشیا، اور بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندان توحید

کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلے کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے ہی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا؟ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے۔ اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر پڑے گا، ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عاید ہوتے ہیں ہم اُن سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم منظم طور پر عزم نہ کرلیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم، متحد اور ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھیرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن سے ہماری ملت کی زندگی اور موت وابستہ ہے بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتے کے بارے میں ناامید نہیں۔ لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کرکے اس کا مقابلہ کرنا پڑے۔ ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تُلی بیٹھی ہوں۔"

(خطبۂ صدارت الٰہ آباد ——— بحوالہ طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

اور پھر اس کے لئے لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا۔

اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور زندہ پائندہ اور تابندہ وہ اہم نظریۂ حیات سے جو وہ پیش کرتا ہے، نورِ بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشرہ قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

اور ازاں بعد اس دانائے راز کی شدتِ آرزو یوں لبوں پر آئی۔

میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو **مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔** (ایضاً)

اس الگ خطۂ زمین کا حصول اور اس جداگانہ مملکت کا قیام کیوں اتنا ضروری تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے

علامہ موصوف نے اسی خطبہ میں فرمایا۔

اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ..... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ (ایضاً)

انہوں نے مسلمانوں کی قومی امنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی مزید وضاحت کی اور کہا۔

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے ان کا مقصود وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ اور تسلط حاصل ہو۔ (ایضاً)

اقبالؒ نے اس تاریخی خطبہ میں جو اٹل حقائق پیش کئے وہ ملت کے لئے تنظیم و عمل کا پیغام بھی تھے اور دعوتِ انقلاب بھی۔ کاروانِ ملت کے لئے اس میں منزل کی نشاندہی بھی تھی اور بانگِ رحیل بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی انوارِ قرآنی سے فیض یاب نگاہ بصیرت پورے یقین و اعتماد سے دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا وہ مستقبل کے افق پر محسوس و مشہود اور زندہ جاوید تاریخی حقائق کی صورت میں جلوہ بار ہو کر رہے گا۔

اسلام۔ ثبات و تغیر کا حسین امتزاج

اقبالؒ نے ہمیں نہ صرف پاکستان کا تصور عطا کیا بلکہ اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ جس اسلامی دستورِ حیات کو اس جداگانہ مملکت کی روح بننا ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ یہی خصوصیات ہیں جنہیں نگاہوں سے اوجھل کر کے ہم حصولِ پاکستان کے بعد پے در پے ناکامیوں، مایوسیوں اور گوناگوں الجھنوں کی گردش دولابی کا شکار رہے۔ سنیئے کہ انہوں نے اپنے خطبات ـــــ تشکیلِ الٰہیاتِ جدید ـــــ میں اس حقیقت کو کس قدر نکھار کر منظرِ عام پر پیش کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق اور توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس کے لئے دنیا میں، جہاں تغیر کا دور دورہ

> ہے، ابدی اصول ہی محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوتی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تھا اقبالؒ، وہ دانائے راز اور حکیم انقلاب جس نے سرسیدؒ کی پھیلائی ہوئی روشنی میں کاروانِ ملت کے ذوقِ سفر کا رخ اس کی حقیقی منزل مقصود کی طرف پھیر دیا۔ جہاں سرسیدؒ نے صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قوم کے فکر و بصیرت سے اپیل کی اور جذبات کے دھاروں پر بہنے کی بجائے زندگی کی عملی حقیقتوں سے عہدہ برآ ہونا سکھایا۔ وہاں اقبالؒ نے بھی اپنی حیات آفریں دعوت علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کی۔ یہی خوشگوار اور خوش آیند انقلاب تھا جو مدتوں کے بعد ہماری قومی زندگی میں بپا ہوا۔ یعنی قوم پہلی بار جذبات کی ہنگامہ خیزیوں اور پُرفریب نعرہ بازیوں سے دامن کشاں ہو کر سنجیدگی سے اپنے مقام اور منزل کو سمجھنے پر مائل ہوئی۔ اگر تاریخی نشیب و فراز کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ذہنی انقلاب معمولی کام نہ تھا بلکہ بہت بڑی معجز نمائی تھی جو خدائے ذوالمنن کی عنایات بے نہایات کے صدقے میں ہمیں نصیب ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

قائد اعظم ــــ محمد علی جناحؒ

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا

سرسیدؒ و اقبالؒ کی مساعی جمیلہ کے بعد جو عظمت آفریں شخصیت ہمارے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لئے آگے بڑھی اور اُسے ساحلِ مراد سے ہمکنار کر کے دم لیا وہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ تاریخ شہادت دے گی کہ اس قائد جلیل کی شانِ قیادت نے اپنے تگ و تاز کے پورے دور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈر شپ کا سکہ جمانے

کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا، اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیسا حیرت انگیز ہے سیاسیاتِ ہند کی تصویر کا یہ دوسرا رُخ کہ جناحؒ مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی ہے جناحؒ کی عظمت کا وہ امتیازی نشان جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتحِ عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصولِ پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔

قیادتِ ملّی اور اقبالؒ کا حُسنِ انتخاب

اقبالؒ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک مفکر کے مقام سے تجاوز کر کے اسلامیانِ ہند کے منصبِ قیادت کو اپنائیں ـــ ان کے خلوص کا تقاضا یہی ہو سکتا تھا ـــ ان کی نگاہیں اس قائد کی تلاش میں تھیں جو قومی زندگی کے لئے اور نازک ترین مرحلوں میں قیادت کی پُرپیچ ذمہ داریوں سے دوٹوک انداز سے عہدہ برآ ہو سکے اور کوئی اس کے حسنِ سلوک پر حرف گیری کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ صرف جناحؒ تھے جو ان کے حسنِ انتخاب کے شایانِ شان قرار پا سکے اور ان کی کوششوں سے قوم کو وہ قائد مل گیا جس کے حُسنِ تدبّر کے صدقے میں پاکستان جیسی عظیم مملکت کا وجود نقشۂ عالم پر مرتسم ہوا۔ ۱۱ر جون ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناحؒ کے نام ایک مکتوب میں اقبالؒ نے یہ لکھا تھا کہ

> ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں، صرف آپ ہی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔

یہ تھیں وہ امیدیں جو اقبالؒ نے قوم کی طرف سے جناحؒ سے وابستہ کیں اور تاریخ نے شہادت دی کہ جناحؒ نے انہیں بحسنِ کمال پورا کر کے دکھایا۔ اقبالؒ کے خطاب الٰہ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناحؒ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور اس کے بعد اس قرارداد کو حاصلِ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ تگ و تاز شروع ہو گئی تھی جو ۱۹۴۷ء میں حصولِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس مدت میں قائداعظمؒ کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل باب[1] ہے اور ایک الگ داستان۔ یہاں ہم قائداعظمؒ کے بعض اہم خطابات سے ان مقاصد کو روشنی میں لائیں گے جو تحریکِ پاکستان کے لئے اساسی

---

[1] اس تفصیل کا ایک حصہ "قائداعظمؒ" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعتوں میں سامنے آ چکا ہے۔

درجہ رکھتے ہیں۔

انہوں نے ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تقریب پر حاضرین سے پہلے یہ سوال کیا کہ

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ اور وہ کون سا لنگر ہے جس کی بدولت اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اور پھر خود ہی ان اہم سوالات کے جواب میں فرمایا۔

وہ بندھن اور وہ رشتہ، وہ چٹان اور وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی ـــ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک اُمت۔

۸ر مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ

ہندو اور مسلمان، خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے افراد نہیں بن سکتے، وہ ہمیشہ دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں ...... پاکستان تو اُسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

(تقاریر جناحؒ ـــ حصہ دوم)

اور پھر اس کے بعد ۲۴ر نومبر ۱۹۴۵ء کو (ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے) انہوں نے فرمایا۔

ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (ایضاً ـــ صفحہ ۲۴۵)

۲ر مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ لاہور) میں تحریک پاکستان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے پنجاب کے مسلم طلباء کو ایک نئے عزم اور تازہ ولولوں سے سرشار کر دیا۔ اس تقریر میں انہوں نے فرمایا۔

پاکستان کے تصور کو جو مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اپنی

طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت معرض وجود میں آگئی ہے جو اسلام کی عظمت رفتہ کو از سر نو پھر زندہ کرے گی۔ (ایضاً - صفحہ ۵۰)

۱۸۔ جون ۱۹۴۵ء کو قائداعظمؒ ایک بار پھر صوبہ سرحد کے شاہین بچوں کو ایک اہم پیام انقلاب دے رہے تھے۔ اس پیغام میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی وساطت سے اسلام کے نونہالوں پر واضح کیا تھا کہ

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (درحقیقت) مراد وہ مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے ہم خود ہی متمتع نہیں ہوں گے بلکہ ہمارے ساتھ اور بھی فیضیاب ہوں گے۔ . . . . ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ (ایضاً - ۳۶۷)

مملکت کا اسلامی تصور

قائداعظمؒ کیخلاف مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ اسلام کے معاملہ میں نابلد سے تھے۔ قائداعظمؒ نے مخالفت کے اس گھناؤنے انداز کا جواب ہمیشہ خود اعتمادی کی مسکراہٹ سے دیا۔ کیونکہ ملت کے عظیم ترین قائد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قافلے کو جس اسلامی منزل کی طرف آگے بڑھایا تھا اس کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اسلام کے زندہ پائندہ حقائق سے بے خبر رہتے۔ یہ درست ہے کہ قائداعظمؒ کو فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ تھا لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و برتری کا تعلق ہے انہوں نے اس کی روح تک کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے گہرے اسلامی مطالعہ کا اندازہ اس انٹرویو سے بخوبی ہو سکے گا جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے طلبا کو دیا تھا۔ بڑے اہم سوالات کئے تھے ان طلبا نے اور ہم سطور ذیل میں اس سلسلہ سوال و جواب کو بعینہٖ پیش کرتے ہیں جو اورینٹ پریس کی رپورٹ کے حوالے سے اپریل ۱۹۴۲ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا اس قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلام کے

اجزا کا سارا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :- ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصے میں قائداعظمؒ نے جو کچھ کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں ہماری زندگی میں پیدا شدہ تمام مشکلات و موانعات کا نکھرا ہوا حل موجود ہے۔ اور اس سے وہ تمام الجھنیں اور پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں جو اسلامی دستور اور اسلامی مملکت کے سلسلے میں ہمارے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے جواباً فرمایا تھا۔

جواب :- ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، تو یہ بالکل واضح ہے اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ

اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

سنجیدہ فکر کا مطالبہ

کیا صدیوں کی ملوکیت کے بعد ایک مملکت کو اسلامی بنانے میں جو الجھنیں حائل رہی ہیں انہیں ختم کرنے کے لئے یہ الفاظ سنگِ میل راہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے؟ اگر ملت جذبات پرستی سے بالاتر ہو کر حسنِ نیت اور خلوصِ فکر کی روشنی میں اپنا مستقبل متعین کرنا چاہے تو اسے لامحالہ ان الفاظ کو مشعلِ راہ بنانا پڑے گا اور اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہ ہو سکیگا۔ سرسیدؒ۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اس بدنصیب قوم کو جذبات پرستی کی تند آندھیوں اور مسلکِ تقلید کی گہری تاریکیوں سے نکال کر فکر و بصیرت کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرنے کے قابل بنایا تھا۔ لیکن قوم کی بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ حصولِ پاکستان کی فاتحانہ معرکہ آرائی کے بعد جب قیادت کا میدان خالی ہو گیا تو قوم کے جذبات سے کھیلنے والے مفاد پرست عناصر پھر آگے بڑھ آئے، اور ہمارے سب سے بنیادی مسائل کو بھی جو انتہائی سنجیدہ فکر کے محتاج تھے، جذباتی رجحانات کے سپرد کر دیا اور اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

سرسیدؒ کی کامیاب قیادت سے قبل بھی ہمارے عوام مدتوں جذباتی شورشوں میں مگن چلے آئے اور ان شورش پسندیوں نے ان کی اجتماعی قوت کو مضمحل بنا کر رکھ دیا۔ سرسیدؒ کی صحت مند اور مضبوط قیادت نے بے نتیجہ شورشوں اور ہنگاموں کی اس نمائش کو ختم کیا اور افرادِ ملت میں یہ صلاحیت بحال کی کہ وہ مسائل زندگی سے خالص عقل و فکر کی سنجیدگی کے ذریعے عہدہ برآ ہوں۔ ہنگامہ خیزیوں اور زوال پذیریوں کے اس ماحول میں یہ کارنامہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ سرسیدؒ کے بعد اقبالؒ آئے اور اپنی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ باریوں سے ہر نشیب و فراز میں افکارِ تازہ کی روشنی پھیلا دی۔ اور سب کا رُخ نشانِ منزل کی طرف پھیر دیا۔

قومی زندگی کی یہ منزل بڑا ہی کٹھن مرحلہ ثابت ہوئی۔ یہاں سیاست کے مغربی تصورات نے ذہنوں پر پورا تسلط جما رکھا تھا۔ اگرچہ اقبالؒ کے انقلاب آفریں نغمے ان تصورات کا جادو توڑ چکے تھے لیکن ایوانِ حکومت کا ہر فیصلہ انہی کی رُو سے طے پاتا تھا۔ اور بین الاقوامی دائروں میں بھی انہی تصورات کی کارفرمائی قائم تھی۔ یہ شرفِ عظیم صرف قائداعظمؒ کی قسمت میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا دعوےٰ لے کر ان بارگاہوں میں داخل ہوں اور دلائل و براہین کی بے پناہ اور بے مثال قوت سے نہ صرف مروجہ سیاست کے مسلّمہ ضابطوں کو غلط ثابت کر دیں۔ بلکہ انگریز اور کانگریس جیسی عظیم الشان قوتوں کو اپنے دعوے کی عظمت و صداقت قبول کرنے پر مجبور کر دیں ——— آسمان کی نگاہوں نے اس صدی میں فراست اور تدبّر کا اس سے عظیم تر شاہکار نہیں دیکھا اور مملکت پاکستان کا وجود اس فتح مبین کی زندہ جاوید شہادت ہے۔

قائداعظمؒ کے اس شاہکار کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قومی فکر و شعور کی سنجیدگی کو جو سرسیدؒ و اقبالؒ کی کاوشوں کا نتیجہ تھی بدستور قائم رکھا۔ ان کے مخالفین نے قدم قدم پر عوامی جذبات کو اُبھارا۔ لیکن قائداعظمؒ کا ہر پیغام اور ہر خطاب فکر و بصیرت کی اسی سنجیدگی کا آئینہ دار تھا۔

اگر اقوامِ عالم میں حقیقی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جذبات سے کھیلنے کی بجائے حقائق سے عہدہ برآ ہونا سیکھو۔

یہ تھا اس شریفانہ جنگ کا نعرہ جس کا آغاز سرسیدؒ سے ہوا جسے فکرِ اقبالؒ نے توانائیاں بخشیں اور جسے قائداعظمؒ کے حسنِ تدبّر نے فاتحانہ انجام سے ہمکنار کیا۔ کیا آج پھر وقت نہیں آ گیا کہ ہم اس فراموش کردہ سبق کو از سرِ نو یاد کریں؟

(※)

مشرق و مغرب

پچھلے دنوں ایک نجی مجلس میں اقبالؒ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اقبالؒ کے ہاں "مشرق" اور "مغرب" کے الفاظ اکثر ملتے ہیں، معلوم نہیں ان سے اُن کا مفہوم کیا ہے۔ آیئے یہ دیکھیں کہ اقبالؒ کے ہاں ان اصطلاحات سے مراد کیا ہے؟

اقبالؒ کے ہاں مشرق یا مغرب سے مفہوم کوئی خاص خطۂ زمین نہیں۔ ان سے مفہوم زندگی کے دو جداگانہ تصورات (IDEOLOGIES) ہیں۔ مشرق کو آپ دیکھیے تو اس میں آپ کو ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آئیگی۔ قرآن نے جن انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے وہ سب مشرق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ سب کے سب سامی النسل تھے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان انبیاء کے علاوہ جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے مختلف اقوام میں اور انبیاء بھی آتے رہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صرف مشرقی اقوام ہی ہیں جو اپنی تعلیم کو انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہیں، یا یوں کہیئے کہ اپنے ہاں کے نوشتوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ مغرب کی کسی قوم کا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کے ہاں کوئی نبی آیا

مشرق

تھا، یا ان کے ہاں کوئی تعلیم ایسی ہے جس کا سرچشمہ ذہنِ انسانی سے ماورا ہو۔ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت عام ہے لیکن ان دونوں مذاہب کے رسول مشرقی ہیں مغربی نہیں۔ لہذا مشرق کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحی کی قائل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب سرزمینِ مشرق ہی کی پیداوار ہیں۔ لہذا یوں کہیئے کہ اقوامِ مشرق مذہب پرست ہیں۔ مذہب میں ایک طرف کسی بالاہستی کا تصور ناگزیر ہوتا ہے، اور دوسری طرف کسی نہ کسی شکل میں موت کے بعد کی زندگی کا عقیدہ بھی۔

اس کے برعکس مغرب کو دیکھیئے۔ وہاں یا تو فلسفہ کارفرما رہا ہے اور یا عصرِ حاضر میں طبیعات کی بنیادوں پر

مغرب

پیدا شدہ تصوراتِ زندگی۔ فلسفہ ہو یا طبیعات، دونوں کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے یہ ماورائے سرحدِ ادراک کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں علوم کا دائرہ محسوسات میں گھرا ہوتا ہے۔ وہاں تمام مسائلِ حیات کا حل تنہا عقل کی رو سے تلاش کیا جاتا ہے عقل ہمیشہ وقت کی مصلحتوں کے تابع چلتی ہے۔ اس

لئے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں وقت کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا یوں کہئے کہ مغرب کی دنیا میں مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں صرف تقاضائے مصلحت (EXPEDIENCY) فیصلے کا معیار قرار پاتا ہے۔ وہاں یا تو کسی بالا ہستی کا تصور ہی نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو صرف ایسے خدا کا جو کائنات کی مشینوں کو ایک دفعہ کوک دے کر الگ ہو بیٹھا ہے اور اب یہ مشینری قوانینِ فطرت کے مطابق خود بخود چلے جا رہی ہے۔ اگر وہ لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا انہی قوانینِ فطرت کا نام ہے اور چونکہ قوانینِ فطرت دنیائے محسوسات ہی سے متعلق ہیں اس لئے خدا بھی انہی چار دیواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ زندگی مادی اجزا میں ایک خاص ترتیب سے پیدا ہو جاتی ہے اور اسی ترتیب کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی اعمال کا تعلق اسی دنیا تک ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔

یہ ہیں وہ متضاد تصورِ حیات اور نظریاتِ زندگی جن کی مظہر مشرق اور مغرب ہیں۔ اقبالؒ جب مشرق کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی تصوراتِ زندگی ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تصورات مختلف اقوامِ مشرق میں مشترک ہی کیوں نہ ہوں لیکن کہیں یہ بالکل خالص اور غیر ملوث شکل میں اور کہیں ان میں ذہنِ انسانی کی آمیزشیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ اپنی اصلی اور غیر ملوث حالت میں صرف قرآن کے اندر باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر ان میں انسانی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبالؒ جب مشرق کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی مفہوم قرآن ہی کی تعلیم ہوتا ہے اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مغربی تصوراتِ حیات کے مقابلہ میں لاتا ہے اور انہیں چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے مقابل میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش کریں۔

عقل اور عشق

ایک مرتبہ ایک نجی صحبت میں حضرت علامہؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ تمام انبیاءؑ مشرق ہی میں کیوں آئے مغرب ہی میں کیوں نہ آئے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کہ بات یوں تھی کہ روزِ ازل جب خدا اور ابلیس میں جھگڑا ہوا ہے تو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک بانٹ لئے تھے۔ مشرق کو خدا نے لے لیا اور مغرب ابلیس کے حصہ میں آ گیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اقبالؒ مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ مشرق کی برتری ثابت کرتا ہے۔ یہ برتری درحقیقت عقلِ انسانی کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کے مقابلہ میں وحی پر مبنی نظامِ زندگی کی برتری کے مترادف ہوتی ہے۔ اقبالؒ کا سارا پیغام اسی برتری کا نقیب ہے اور اس کو عام کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کی فکر کا ماحصل عقل کے مقابلے میں عشق کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرنا ہے اور عشق سے اس کی مراد وحیِ خداوندی ہوتی ہے۔ عقل ہی کا دوسرا نام اس کے نزدیک تہذیبِ فرنگ ہے۔ دیکھئے کہ وہ "پیامِ مشرق" میں فرنگ کے نام کیا پیغام دیتے ہیں۔

زمن اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ	عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند	عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ	آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

دانشں اندوختم دل زکف انداختم
آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختم

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است	بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادن نظرے	ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوشا آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

لیکن اقبال ؒ کے ہاں مشرق و مغرب سے ایک مفہوم اور بھی ہے اور اس مفہوم کے لئے بھی اقبال ؒ نے ان اصطلاحات کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ مشرق کو تعلیم تو وحی کے ذریعہ ملی لیکن اس نے اس تعلیم کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ ان کی

مذہب پرستی

نگاہوں سے زندگی کا مقصود ہی او جھل ہو گیا۔ ان کے ہاں حقائق کی جگہ اشخاص پرستی نے لے لی۔ دین کے نظامِ زندگی کی جگہ دھرم (مذہب) کی رسومات آگئیں۔ عقل و فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی۔ قوائے فکریہ کے ساتھ ہی ان کے قوائے عملیہ بھی مفلوج ہو گئے۔ دنیا کی زندگی کو قابلِ نفرت سمجھ کر انہوں نے اپنی توجہ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ "آخروی[1] زندگی" پر مرکوز کر دیا اور اس زندگی سے مفہوم اپنی موہوم امیدوں کے علاوہ کچھ نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ تمام اقوامِ مشرق رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔

ان کے مقابلے میں مغرب نے ہر سامنے آنے والے معاملہ کو علم اور عقل کی رُو سے جانچا اور اس کا عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قوانینِ فطرت کے مطالعہ اور اشیائے فطرت کے مشاہدے سے انہوں نے قوائے فطرت کو ایک ایک کر کے مسخر کر لیا۔ انہوں نے زمین پر جال بچھا دیئے، پانیوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ فضا کی پہنائیوں پر مسلط ہو گئے اور اپنی قوتوں سے ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے ہاں کمی رہ گئی تو فقط یہ کہ ان کے پاس مستقل ضابطۂ حیات ایسا نہ تھا جس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھ سکتے۔

اقبال ؒ کے ہاں مشرق سے دوسرا مفہوم وہی پژمردگی اور افسردگی، بیکسی اور بے بسی، محکومی اور ناامیدی،

---

[1] وہ آخروی زندگی نہیں جس کا تصور قرآن نے دیا ہے، بلکہ انسانوں کے ذہن کی خود ساختہ آخروی زندگی کا تصور۔

تقلید وجمود اور بے حسی اور بے عملی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب سے مفہوم بے باک قوتیں اور بے ضبط طاقتیں ہوتا ہے۔ اس مقام پر وہ مشرق اور مغرب دونوں پر سخت تنقید کرتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ

مشرق ہمہ افسانہ، مغرب ز تو بیگانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اقبالؒ کے پیغام میں جہاں جہاں مشرق کی تنقیص ہے وہ اس تصورِ حیات پر تنقید ہے جس نے ان سے زندگی کی حرارت چھین کر ان کی دنیا کو مُردوں کی بستی بنا رکھا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک نہ مشرق کے یہ انداز صحیح ہیں نہ مغرب کے وہ اسلوب۔ اس کے نزدیک صحیح نظامِ زندگی عقل اور عشق کے امتزاج کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام۔ اس کے لئے وہ مشرق اور مغرب دونوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ!

اور یہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفسیر ہے۔ اس کے نزدیک مردانِ مومن کی تعریف یہ ہے۔ اُولُوا الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ۔ یعنی اربابِ عقل و دانش جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت اپنے سامنے وحی کے محکم قوانین کو رکھتے ہیں اور انہی کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اقبالؒ دنیا میں اسی قسم کے انسان دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ مغرب والوں سے کہتا تھا کہ وہ مشرق سے وحی کا تصور لے لیں اور مشرق والوں سے کہتا تھا کہ وہ مغرب والوں سے عقل کی باتیں سیکھیں۔ اقبالؒ کا جہانِ نو وہی تھا جس میں ہر کام عقل اور وحی کے اس حسین امتزاج سے طے پائیں اور اس طرح مشرق اور مغرب کی حدود مٹ کر اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کا منظر عام ہو جائے۔ اسی میں وہ فوز و فلاح انسانیت کا راز دیکھتا تھا۔ اور اسی میں وہ قیامِ آدمیت کا امکان پاتا تھا۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں	کراچی میں
ہر اتوار کی صبح ۹ بجے	ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور	بذریعہ ٹیپ سیمنار ہال۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ

معرکۂ دین و وطن

علامہ اقبالؒ

حصولِ پاکستان کے دعوے کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ اسلام میں قومیت کا مدار، وطن، نسل، حسب و نسب، زبان - وغیرہ کی نسبتوں پر نہیں بلکہ آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک پر ہے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں اس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندوستان (یعنی ہندو) قوم کا جزو نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی جہت سے، ایک جداگانہ مستقل قوم ہیں۔ اور جب یہ ایک مستقل قوم ہیں تو انہیں اپنی الگ مملکت متشکل کرنے کا حق حاصل ہے جہاں یہ اسلام کے تابع آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ یہ دعویٰ، قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور اسلام کی روح تھا لیکن (بدقسمتی سے) ہندوستان کے مسلمانوں ہی کے ایک گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور مزید بدقسمتی یہ کہ اس گروہ کے سرغنہ "نیشنلسٹ علمائے کرام" تھے۔ چنانچہ یہ موضوع کہ اسلام میں قومیت کا مدار کیا ہے، اُس زمانہ میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اور طلوعِ اسلام، اسلامی نقطۂ نگاہ کا سرگرم نقیب تھا۔ اس باب میں، علامہ اقبالؒ کا ایک بیان (جس کا عنوان معرکۂ دین و وطن تھا) قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معرکہ آرا بیان کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں عین اس وقت جبکہ برصغیر ہند کے مسلمان اپنی جداگانہ قومی حیثیت کا پرچم لے کر اٹھے تھے اور مسلم لیگ ان کی اس قومی حیثیت کی آئینی و قانونی توثیق کے لئے کانگرس سے برسرِ پیکار تھی نیشنلسٹ مسلمانوں کے پیشوا اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دلّی کی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ ایک مشہور و معروف مذہبی پیشوا کی زبان سے یہ نعرہ؟ شاید مسلمان اس فتنۂ عظیم کو جو اس نعرہ میں پوشیدہ تھا ایک عرصہ تک سمجھنے کے قابل نہ ہوتے اور "شیخ الہند" کی یہ آواز کانگریس کے ہم سیاسی عزائم کے حق میں

اپنا کام کر جاتی - لیکن علامہ مرحوم جوان دنوں بسترِ مرض (بلکہ مرض الموت) پر پڑے تھے - اس تعرے کی فتنہ انگیزیوں کو نظر انداز نہ کر سکے - اپنی شدید علالت کے باوجود ملت کا یہ قلبِ حساس تڑپ اٹھا اور اس کی یہ تڑپ و خلش اس آہِ آتشیں کی صورت میں لبوں تک آگئی -

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے نیشنلسٹ حلقہ بگوش اس سے بڑے طیش میں آئے اور بالخصوص مولانا موصوف نے اس کے جواب میں ایک بیان شائع کر کے جہاں علامہ اقبال کو عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا وہاں "قاموس" کے حوالوں سے "قوم" اور "ملت" کا فرق واضح کرنے کی بھی کوشش کی اور یہ کہا کہ انہوں نے (جیسا کہ علامہ اقبال کے مذکورہ شعر میں کہا گیا ہے) اپنی تقریر میں "ملت" نہیں بلکہ "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا - علامہ اقبال کے نزدیک مولانا مدنی کی یہ کوشش "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف تھی - چنانچہ وہ ان پیدا کردہ فتنوں سے ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کو بچانے کے لئے غیرتِ دینی سے مسلح ہو کر میدان میں آگئے اور بیماری کے عالم میں زیرِ نظر تاریخی بیان حوالۂ اشاعت کیا "معرکۂ دین و وطن" کی اس آویزش میں جو اس وقت ملک میں جاری تھی اس بیان نے ضربِ کلیم کا کام دیا - نیشنلسٹ مسلمانوں کے تمام قلعے مسمار ہو کر رہ گئے - ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمان کی منزل پوری طرح نکھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی - اور دین کا عطا فرمودہ قومی تصور وطنی قومیت کے نظریئے کو شکستِ فاش دے کر اساسِ دین پر ایک جداگانہ مملکت (پاکستان) کو معرضِ وجود میں لانے میں کامیاب و کامران ہو گیا -

چونکہ پاکستان کی بنیاد ہی اس حقیقت پر ہے کہ مسلمان، اسلام کے اشتراک کی وجہ سے ایک مستقل قوم ہیں، اور اس میں افغان - پنجابی - بلوچی - سندھی - بنگالی غیر بنگالی کی کوئی تمیز نہیں، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بصیرت افروز اور حقیقت کشا بیان کے عام کرنے کی از حد ضرورت ہے - اس بیان کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس کے اس حصہ کو جس کا تعلق اس بنیادی مسئلہ سے ہے - یوم اقبال کی تقریب کے سلسلہ میں مکرر شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں -

بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے اپنے مصرع

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ "ملت" "قوم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی اور بالخصوص قرآن مجید میں یہ لفظ "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی۔ فارسی اور ترکی زبان میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "ملت" "قوم" کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم "ملت" بمعنی "قوم" ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن، چونکہ لفظ "ملت" کے معنی زیر بحث مسائل پر چنداں موثر نہیں ہیں اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کا ارشاد یہی تھا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔

یورپ کی ملوکانہ اغراض اور نظریہ وطنیت

مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں۔ ایسے مشورہ سے "قومیت" کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے۔ جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے ازبس ضروری ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپاگنڈا مقصود ہے۔ حاشا و کلا میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "فرنگی نظریہ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے۔ اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریئے ان کے لئے جاذبِ نظر ہیں۔ مگر افسوس ؎

تو نہ گرد کعبہ را رخت حیات ۔۔۔ گر ز افرنگ آیدش لات و منات

سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے "اقوام" "اوطان" کی طرف اور "اوطان" "اقوام" کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی۔ عربی۔ جاپانی۔ ایرانی وغیرہ۔ "وطن" کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے۔ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ اور۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اسلام اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامقبول و مردود ہے۔ اس کلیے سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قومیں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے؟ یا ہندوستان کی مختلف قومیں یا ملتیں ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب کے قول کے دینی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔

اسلام واحد جماعتی نظام ہے

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن۔ سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے

اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا ہی داعی نہیں - بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر ان میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے - تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" "قومی" تھا جیسے مصریوں یونانیوں اور ھندیوں کا - بعد میں "نسلی" قرار پایا جیسے یہودیوں کا - مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ "دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے" جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ "دین" چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس لئے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف "اسٹیٹ" ہے - یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے - نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً "انسانی" ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے - ایسا دستور العمل "قوم" اور "نسل" پر بنا نہیں کیا جا سکتا - نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کہا جا سکتا ہے - صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک "امت" کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے - کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے ع

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

مسلمانوں کو بروقت انتباہ

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانی کے خلاف ہوگی - چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے - جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے - ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہیں بن سکتی تھی - انہوں نے یہ اساس "وطن" کے تصور میں تلاش کی - کیا انجام ہوا - اور ہو رہا ہے ان کے اس انتخاب کا ؟ لوتھر کی "اصلاح" "غیر سلیم عقلیت" کا دور - اصول "دین" کا "سٹیٹ" کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ - یہ تمام قوتیں دھکیل کر یورپ کو کس طرف لے گئیں ؟ لادینی - دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف - کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا یا بھی اسی تجربہ کا اعادہ ہو ؟ مولوی صاحب زمانہ حال میں "قوم" کے لئے "وطن" کی اساس ضروری سمجھتے ہیں - بیشک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے - مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں - بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں جو اس قسم کی "قوم" کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں - مثلاً "دین" کی طرف سے بے پروائی - روزمرہ سیاسی زندگی میں انہماک - اور علیٰ ہذا القیاس - دیگر موثرات جن کو مدبرین اپنے ذہن سے پیدا کریں - تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے - مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر ایسی "قوم" میں مختلف ادیان و ملل ہوں تو بھی رفتہ رفتہ وہ تمام "ملتیں" مٹ جاتی ہیں اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک

رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو "دین" کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان! سو افسوس ہے ان سادہ لوحوں کو اس نظریۂ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن" بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یک جا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو اشتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

مگر جو فقرہ مولانا حسین احمد کے ارشادات میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُمتِ محمدیہ ﷺ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ "قوم" استعمال کیا یا لفظ "ملت" ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امتِ محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا ہے۔ لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے "ملت" اور "قوم" کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ "ملت" کو "قوم" سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے گا جو دینِ اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں۔ واقف کار لوگوں کو یہ تول دھو کا نہیں دے سکتا۔

دینی وحدت میں مذہب و سیاست کی ثنویت

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت "قوم" اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت "ملت" اور

دوسرا یہ کہ از روئے "قوم" چونکہ وہ "ہندوستانی" ہیں۔ اس لئے "مذہب" کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی "قومیت" یا "ہندوستانیت" میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ یہ صرف "قوم" اور "ملت" کے الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اور جسے اختیار کرنے کے لئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو۔ اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے

مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔

قرآن سے استشہاد کیوں نہیں؟

مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ میں نے لفظ "ملت" اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا اور میں "ملت" کو "وطنی قوم" سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے گویا اگر "قوم" زمین ہے تو "ملت" بمنزلِ آسمان ہے۔ لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی۔ اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم اور قومیت کو آسمان بناؤ۔ دینِ فطرت "زمین" بنتا ہے تو بننے دو۔

مولانا یہ فرض کر کے کہ مجھے "قوم" اور "ملت" کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے یہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں "قاموس" کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے زبانِ عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر مولانا میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر "قاموس" سے گذر کر قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرما لیتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالمِ دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب ؎

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف "قاموس" پر اکتفا کی؟ قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ "قوم" استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں "ملت" کا لفظ بار بار نہیں آیا؟ آیاتِ قرآنی میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے؟ اور کیا جماعتِ محمدیہ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ "اُمت" بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا ان الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلافِ معانی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ نوامیسِ الٰہیہ کا پابند ہو۔ اور ملکی اور وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی۔ جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی۔ وہ بہت حد تک درست ہے۔ قوم کے معنی جماعۃ الرجال فی الاصل دون النساء ہے۔ گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں قوم موسیٰؑ اور قوم عاد کے الفاظ آئے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ "ملت" کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں۔

اہم سوال

لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان اولاً۔ اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معرّف جماعت ہیں۔ جس کی اساس توحید اور ختم نبوّت پر ہے یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک یا رنگ و زبان ان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملّی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام و قانون کے ماتحت کوئی اور ہیئت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟

ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآن حکیم نے اپنی آیات میں انہیں لفظ "قوم" سے تعبیر کیا ہے؟ یا صرف لفظ ملّت یا امّت ہی سے پکارا گیا ہے۔

ثالثاً اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے؟ کیا کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مؤمنو! "قوم مسلم" میں شامل ہو جاؤ۔ یا اس کا اتباع کرو۔ یا یہ دعوت صرف ملّت کے اتباع اور اُمّت میں شمولیت کی ہے؟

قرآن کریم میں ملّت کا مفہوم

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں جہاں جہاں "اتباع" و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملّت یا اُمّت وارد ہوا ہے کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے ومن احسن دیناً ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن و اتبع ملۃ ابرٰھیم حنیفاً۔ واتبعت ملۃ اٰبائی ابرٰھیم فاتبعوا ملۃ ابرٰھیم حنیفا۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ 'ملّت' نام ہے ایک دین کا۔ ایک شرع و منہاج کا۔ 'قوم' چونکہ کوئی شرع و دین نہیں۔ اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث ہے۔ کوئی گروہ ہو۔ خواہ وہ قبیلہ کا ہو۔ نسل کا ہو۔ ڈاکوؤں کا ہو۔ تاجروں کا ہو۔ ایک شہر والوں کا ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو۔ وہ محض گروہ ہے۔ رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف منسوب بھی کرتا ہے۔ مثلاً قوم نوحؑ۔ قوم موسیٰؑ۔ قوم لوطؑ۔ لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدر کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد۔ قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسیٰؑ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی قال الملاء من قوم فرعون اتذر موسیٰ و قومہ لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے توحید کو تسلیم کرتے گئے۔

وہ اس پیغمبر کی ملت میں آ گئے۔ اس کے دین میں آ گئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دینِ ملت کفار کی بھی ہو سکتی ہے۔ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ۔

ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملتِ ابراہیمی میں داخل ہو گئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ "امت" کے لفظ سے۔

ان گذارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لئے سوائے "امت" کے اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا تو ارشاد فرمائیے۔ "قوم" رجال کی جماعت کا نام ہے۔ اور یہ جماعت بہ اعتبارِ قبیلہ۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن "ملت" سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنانے کی۔ گویا ملت یا اُمت جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔

کانگریسی علماء کی مجبوریاں

عصرِ حاضر کے ہندوستانی علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبی اُمّی کا منشاء ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے۔ جن کی دعوت میں قوموں نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موحد و مشرک اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں اس دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسمٰعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور "قومیت" کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی۔ وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔

الکفرۃ ملۃ واحدۃ

کیا خدا کی بارگاہ سے اُمتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابلہ میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفرۃ ملۃ واحدۃ کی ہے۔

امتِ مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیمہ کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور معادی کا جو اس کے افراد

اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامقبول و مردود ہے۔

قریش مکہ سے جنگ کیوں؟

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے کہ اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب۔ ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دل جوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس کہ آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام، دین قیم اور امتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امتِ مسلمہ کو ہی آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آئی۔ محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد بھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے۔ وہ خواہ انکی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا ؎

کسے کہ پنجہ زد ملک و نسب را — نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ — نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

مقامِ محمدیؐ اور وحدتِ عربیہ

حضور رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو۔ ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے لیکن اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی۔ نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل

اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں "ابدیت" سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہونچنے کے لئے معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں۔

اسلام کا بے مثال کارنامہ

مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اسلام نے اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی۔ قبائلی۔ نسلی۔ قومی اور انسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام تیرہ سو سال میں کیا ہے۔ وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

نظریۂ وطنیت کی ذہنی افتاد

مولانا حسین احمدؒ کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدبر احسان سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ "ملتِ اسلامیہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر موسس ہے" بہت سے مسلمانوں کے لئے تعجب خیز ہوگا لیکن میرے لئے چنداں تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آجائے جس کی دعوت مولانا دیوبند دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدرتاً افکار حرکت کرتے ہیں۔ اس خیال کی طرف کہ بنی نوعِ انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے۔ اس دوسری گمراہی سے جو وطنیت سے پیدا ہوتی ہے" ادیان کی اضافیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کے لئے خاص ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

"شرفِ انسانی" کا مفہوم

یہ ہے نفسیاتی تجزیہ اس تیرہ بخت مسلمان کا جو اس روحانی جذام میں گرفتار ہو جائے۔ باقی رہا نص کا معاملہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کے لئے نص ہے۔ الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسلامیات میں

ان سے مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مؤسس ہو۔ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ للعلمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو "امۃ مسلمۃ لک" کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر "شھداء علی الناس" کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔" (اگست ۱۹۶۰ء)

مقامِ تشکر

پرویز صاحب نے آج سے قریب تیس سال پہلے قرآنی فکر کے عام کرنے کے سلسلے میں، اُس سلسلۂ تصانیف کا آغاز کیا جو دنیائے علم میں، معارف القرآن، کے نام سے مشہور ہے، اسی سلسلہ میں ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، من و یزداں، اسلام کیا ہے؟ شائع ہو چکی تھیں، لیکن اس سلسلۂ زریں کی آخری اور بڑی اہم کڑی ابھی باقی تھی، اس کا تعلق اُخروی زندگی سے ہے۔ مقامِ تشکر ہے مفکرِ قرآن نے اپنی اس مایۂ ناز تصنیف کو بھی مکمل کر لیا اور اس کی کتابت بھی ہو چکی ہے۔ چونکہ کتاب ضخیم ہے، اس لئے اُس کی اشاعت میں شاید کچھ وقت لگ جائے۔

اس سلسلے کی جن کتابوں کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے تھے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد اُن کی از سرِ نو کتابت ہو رہی ہے، اور وہ بھی ہمارے پروگرام کے مطابق رفتہ رفتہ شائع ہوتی جائیں گی۔

(ناظم)

میاں ظفر احسن محمود ایڈووکیٹ

قانونی مشورے

سوال — ایک لڑکی "الف" کا نکاح مسمی "ج" سے آج سے دس سال پیشتر ہوا۔ اس کے بدلے میں اس کے بھائی "ب" کی شادی مسمی "ج" کی بہن سے ہو گئی۔ لڑکی 'الف' کی رخصتی نہ ہوئی۔ بعد ازاں لڑکی کا نکاح مسمی 'ج' سے فسخ کروا کر اس کے بھائی "گ" سے پڑھوا دیا گیا۔ عرصہ ۱/۲ ۴ سال کے انتظار کے بعد جب مسماۃ 'الف' کو بیاہ کر نہ لیجایا گیا تو اس نے فیملی کورٹ میں دعوے دائر کر دیا۔ مگر عدالت سے ناکامی ہوئی۔ اپیل کی مگر خارج کر دی گئی۔ اپیل اس بنا پر خارج کر دی گئی کہ اگر لڑکی 'الف' کو طلاق مل گئی تو "ج اور گ" کی بہن کا جو چار بچوں کی ماں ہے، مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اب مسمی "گ" نہ تو 'الف' کو بیاہ کر لیجاتا ہے نہ ہی طلاق دیتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس پریشانی کا ازالہ کرنے کے لئے مشورہ دیجئے۔ (م ۔ ق)

جواب — محترمی!

اس معاملہ میں تو میں آپ سے متفق نہیں کہ اپیل اس لئے خارج کر دی گئی کہ اس طرح 'ج' کی بہن کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ہمارا قانون بدلہ کی شادی کو قطعاً کوئی حیثیت نہیں دیتا اور اس بنا پر کوئی دعویٰ یا اپیل خارج نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ فیصلہ خلاف قانون تھا اور آپ میعاد مقررہ میں اس کے خلاف عدالت عالیہ میں نگرانی کر سکتے تھے۔

بہرصورت اب آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ عزیزہ بہن 'الف' مسمی 'گ' کے گھر ان کی زوجہ کے طور پر آباد ہونا پسند کرے اور دوئم یہ کہ وہ مسمی 'گ' سے طلاق لینا چاہے۔ دونوں صورتوں میں لائحہ عمل مختلف ہوگا۔

اوّل — اگر صورت آبادی کی ہے تو 'الف' کی طرف سے فیملی کورٹ میں ایک روپے کا کورٹ فیس لگا کر دعویٰ اعادہ حقوق زن و شو (RESTITUTION OF CONJUGAL RIGHTS) دائر کر دیا۔

اور اپنی یونین کونسل کے چیرمین کے پاس ایک درخواست خرچہ نان نفقہ کے لئے از یوم نکاح تا حال اور اس روز تک کے لئے جب تک وہ مسماۃ الف، کوئی الواقع آباد نہ کرے دائر کر دیں۔ اُس میں خرچہ مل جائے گا۔

اس کے علاوہ اگر کوئی حق مہر معجل مقرر ہوا تھا تو اُس کا بھی آپ مطالبہ یونین کونسل کے چیرمین کے پاس درخواست دیکر کر سکتے ہیں۔ یہ رقم آپ کو بذریعہ قرقی وغیرہ مل سکتی ہے۔

دوئم یہ کہ مسماۃ مذکورہ طلاق حاصل کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم نہیں مسماۃ 'الف' کی عمر اس وقت کتنی ہے اور اپیل خارج ہوئی کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔

اگر وہ ابھی بالغ نہیں ہوئی یا اُس کے بلوغ کو تین سال سے کم کا عرصہ ہوا ہے تو وہ حق خیار البلوغ کے استعمال سے اپنا نکاح فسخ کر کے یونین کونسل کے چیرمین کو مطلع کر دے اور مصالحتی اقدام کے بعد طلاق از خود وارد اور قابل عمل ہو جائے گی۔ یا اس کے متعلق فیملی کورٹ میں دعوے کیا جا سکتا ہے۔

اگر بصورت دیگر مدعیہ کے بلوغ کو عرصہ تین سال سے زائد کا ہو چکا ہے تو فیملی کورٹ میں از سر نو دعوے تنسیخ نکاح دائر کر سکتی ہے کہ مدعا علیہ نے عرصہ زائد از تین سال سے حقوق زوجیت ادا نہیں کئے اور خرچہ نان نفقہ ادا نہیں کیا۔ اس میں ڈگری ہونا یقینی ہے بشرطیکہ مقدمہ میں کوئی تکنیکی نقص نہ رہ جائے۔

سابقہ فیصلہ اور حکم عدالت اپیل نئے دعوٰی دائر کرنے میں کسی طور پر مانع نہیں ہے۔

ہم آپ کی یہ خدمت کر سکتے ہیں کہ اگر آپ مکمل کوائف و نقول دستاویزات لے کر کسی کاروباری دن میں میرے دفتر میں آجائیں تو میں آپ کو عرضی دعوے کی درست شکل تدوین کر کے دے سکتا ہوں جو آپ فیملی کورٹ میں دائر کر دیں۔ غالباً آپ کی فیملی کورٹ لائل پور میں ہو گی۔ اگر کوئی امر ابھی تک قابل وضاحت رہ گیا ہے تو تحریر فرمائیں انشاء اللہ واضح کر دیا جائے گا۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ بعض ناگزیر حالات کی بنا پر طلوع اسلام کا زیر نظر شمارہ ضخامت میں کم اور قریب ہفتہ بھر کی تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

اس کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

(ناظم)

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱- لغات القرآن یہ صرف قرآنی الفاظ کی صرف و کشری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے؟ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپے میں۔

۲- اسلام کیا ہے؟ یہ پہلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟ قیمت قسم اعلیٰ آٹھ روپے۔ چیپ ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳- سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے مُلّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کے جوابات کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں قیمت۔ حصہ اول۔ آٹھ روپے۔ حصہ دوم، سوم چھ چھ روپے۔

۴- نظامِ ربوبیت نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔ لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵- خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دورِ عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت قسم اعلیٰ مجلد نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶- سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۷- بہارِ نو یہ مقالات کے مجموعے کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت پانچ روپے۔

۸- اسبابِ زوالِ اُمّت مُلّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں صحیح بات کیا ہے۔ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت ۱ روپے

۹۔ اسلامی معاشرت اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ اندازِ بیان سلیس اور دلچسپ ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت: دو روپے

۱۰۔ قرآنی فیصلے زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے قرآن کیا کہتا ہے؟ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت جلد اول۔ ۳ روپے ۲۵ پیسے۔ جلد دوم۔ ۳ روپے ۲۵ پیسے۔ جلد سوم۔ ۳ روپے۔

۱۱۔ قرآنی قوانین ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلا حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت ۳ روپے

۱۲۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں تمام مذاہب عالم کی مقدس آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں کن کن مراحل سے گذریں اور آج ان کی حالت کیا ہے؟ قیمت ۳ روپے

۱۳۔ جہاد اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی روایتوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔ قیمت دو روپے

۱۴۔ پاکستان کا معمارِ اول ہماری نئی نسل سرسید کے عظمتِ مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ قیمت: تین روپے

۱۵۔ عربی خود سیکھئے قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسلئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴ روپے پچاس پیسے۔

۱۶۔ مقامِ حدیث یہ وہ کتاب ہے جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کیلئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے؟ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علمِ حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: ۴ روپے

۱۷۔ الفتنۃ الکبریٰ مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہدِ حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ قیمت چھ روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور